پاکستان میں اقبالیاتی ادب

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

قیامِ پاکستان سے اب تک کے ساٹھ برسوں پر محیط ''اقبالیاتی ادب'' مختلف النوع، ہمہ گیر اور کثیر الاطراف ہے۔ اس کی حدود بہت وسیع ہیں، یہ ذخیرہ کم و بیش دس شاخوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس گلستانِ ادب میں ایسے اقبالیاتی مصادر بھی منصۂ شہود پر آئے جو اقبالیات میں بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کلامِ اقبال کے تفہیم و تجزیہ کے ضمن میں بھی سیکڑوں کتب منظرِ عام پر آئیں۔ اقبال کے فکر و فن اور شخصیت و کردار پر نہایت قیمتی سرمایۂ کتب وجود میں آیا۔ نقد و انتقاد اور تعریف و توصیف دونوں اعتبار سے اقبال اور فکرِ اقبال کا جائزہ لیا گیا۔ اس نہایت اہم اور دقت طلب کام میں نامور اقبال شناس بھی شریک رہے اور ایسے اہلِ علم و فکر بھی جو اقبال کے فکر و فلسفہ کے ڈانڈے مغرب کے تصوراتِ علم و تہذیب سے ملاتے رہے۔ ساٹھ برس پر محیط اس کام پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اس کی وسعت، پھیلاؤ، تنوع، اثرات اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ ممکن ہے اس جائزے میں بہت سے نشانات نظر سے اوجھل رہ گئے ہوں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تاہم کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلۂ قلم و قرطاس کی کوئی کڑی نظر انداز نہ ہونے پائے۔ اس جائزے سے ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ اقبالیات کے ثانوی مآخذ کے ساتھ ساتھ بنیادی مآخذ پر دقیق تحقیقی کام کی ضرورت اب بھی موجود ہے جس کی طرف ماہرین اور محققین کو توجہ کرنی چاہیے۔

نامور ادیب اور مدیر مخزن سر شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ء-۱۹۵۰ء) اُردو میں مطالعۂ اقبال کے پہل کار (Pioneer) ہیں۔ اگرچہ زبان دہلی (نومبر ۱۸۹۳ء اور فروری ۱۸۹۴ء) اور شورِ محشر لاہور (دسمبر ۱۸۹۶ء) میں چند غزلوں کی اشاعت، لاہور کے مشاعروں میں شرکت اور انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے (۲۴ فروری ۱۹۰۰ء) میں پیش کردہ نظم ''نالۂ یتیم'' کے ذریعے اقبال چند محدود حلقوں میں تو متعارف ہو چکے تھے مگر وسیع تر دنیائے شعر و ادب میں ان کے تعارف اور رونمائی کا اعزاز اقبال کے دیرینہ دوست اور مدّاح سر شیخ عبدالقادر کو حاصل ہے، جنھوں نے مخزن (اپریل ۱۹۰۱ء، ص۳۳) میں اُن کی نظم ''کوہستان ہمالہ'' شائع کرتے ہوئے قارئین کو بتایا کہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے: ''علومِ مغربی و مشرقی دونوں میں

صاحبِ کمال ہیں۔ انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعراے انگلستان ورڈز ورتھ کے رنگ میں کوہِ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔'' [۱]

مخزن کے مابعد شماروں میں اقبال کی غزلیں اور نظمیں، سر عبدالقادر کی تعارفی اور تنقیدی سطور کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔ بعض نثری مضامین بھی مخزن ہی کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ اقبال کی متذکرہ بالا شعری اور نثری تخلیقات کے تمہیدی نوٹ، ایک اعتبار سے اقبال کی شخصیت کے تعارف اور ان کی شاعری پر تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال پر شیخ صاحب کا پہلا مضمون خدنگِ نظر لکھنؤ (مئی ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ انھوں نے ازاں بعد بھی متعدد سوانحی اور تنقیدی مضامین لکھے جن میں بانگِ درا کا دیباچہ تو اقبالیاتی تحریروں میں ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ (مشمولہ مجموعۂ مضامین: نذر اقبال، مرتب: محمد حنیف شاہد۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۲ء) یوں بیسویں صدی کے ربع اول میں اقبال کو متعارف کرانے والوں میں سر شیخ عبدالقادر سرفہرست ہیں۔

اگلے ہی برس ''تنقید ہمدرد'' (قلمی نام: حکیم عبدالکریم برہم) نے اقبال کی شاعری کو ہدفِ تنقید بنایا (اُردوے معلّٰی، یکم اگست ۱۹۰۳ء) اس پر ایک قلمی معرکہ آرائی شروع ہوگئی جس میں خود اقبال کو بھی حصہ لینا پڑا۔ (مخزن، اکتوبر ۱۹۰۳ء)۔ ابتدائی دور کا دوسرا اہم نام محمد دین فوق کا ہے۔ اقبال کی ابتدائی سوانحی کتابوں میں اکثر و بیشتر فوق ہی کے بیانات (۱۹۰۹ء، ۱۹۳۲ء) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ مطالعۂ اقبال کی پیش رفت میں نظم ''شکوہ'' (۱۹۰۹ء) کے ردِ عمل میں لکھی جانے والی نظموں، ازاں بعد اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) کے حوالے سے قلمی معرکہ آرائی نے بھی اقبالیاتی ادب میں معتدبہ اضافہ کیا، تا آنکہ صدی کا پہلا ربع ختم ہوتے ہوئے پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) اور بانگِ درا (۱۹۲۴ء) کی اشاعت نے اقبال پر تعارفی و توضیحی اور تنقیدی تحریروں کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر (۱۹۳۲ء) اقبالیاتی ادب کے دورِ اول کی قابلِ ذکر دستاویز ہے۔ اقبال کے مزید شعری مجموعوں کی اشاعت اور ان کی وفات نے اقبالیاتی مطالعے کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ۱۹۴۷ء تک معروف علمی اور ادبی پرچوں میں بلا مبالغہ سیکڑوں مضامین چھپے، بعض وقیع اقبال نمبر نکلے اور چند اہم کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے ذخیرۂ اقبالیات پر مجموعی نظر ڈالیں تو زیادہ تر تحریریں تشریحی اور توضیحی نوعیت کی ہیں۔ ان میں اقبال کی پیغمبرانہ حیثیت کی تحسین کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بقول سید وقار عظیم: علامہ ''اقبال کے فکری نظام کی اساس اسلامی ہے''۔ [۲] اس کے ساتھ، ان تحریروں میں اقبال کی تحسین و توصیف کا عقیدت مندانہ رجحان غالب ہے البتہ بعض اہل قلم کے ہاں ایک گہرا تنقیدی شعور اور تجزیہ و تحلیل کا ایک بہتر معیار ملتا ہے۔ ''تنقید ہمدرد'' سے جس مخالفانہ تنقید کا آغاز ہوا تھا، اس کا

ایک اور زاویہ سامنے آیا اور وہ یہ کہ اقبال کے بعض معاصرین نے ان کے افکار سے اختلاف کیا خصوصاً ترقی پسند نقادوں (سبطِ حسن، اختر حسین راے پوری وغیرہ) کی طرف سے اختلاف اور مخالفت سے آگے بڑھ کر تعصب اور عناد کے چھینٹے بھی اڑائے گئے۔[۳] برکت علی گوشہ نشین (اقبال کا شاعرانہ زوال ۱۹۳۱ء اور مکائد اقبال ۱۹۳۵ء) کی فرقہ پرستی اور تعصب نے جارحانہ عناد کی شکل اختیار کر لی۔

اقبال کے بعض قارئین کو یہ شکوہ تھا کہ اقبال ''ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' کہتے کہتے ''مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگے۔ پنڈت آنند نرائن مُلا نے بھی یہی شکوہ کیا ہے:

ع ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا، حجازی بن بیٹھا[۴]

شاید اسی پس منظر میں خطبۂ الٰہ آباد پر بعض ہندو اخباروں نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا۔ پرتاپ نے علامہ کو ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان'' قرار دیا اور لکھا ''وہ شاعر ہے، نہ فلاسفر، نہ محبِ وطن ہے۔ وہ ایک تنگ خیال، تنگ نظر اور انتہا درجے کا متعصب مسلمان ہے''۔[۵]

بہرحال اقبالیات کے اس ذخیرے سے ایک بات تو بہت واضح ہوتی ہے کہ اقبال اپنی زندگی ہی میں ایک لی جنڈ (legend) کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ہندستان کی تقسیم (۱۹۴۷ء) تک مطالعہ اقبال کے جو مختلف روپ نظر آتے ہیں، آگے چل کر انھوں نے نسبتاً واضح شکل اختیار کر لی۔

یہاں مطالعۂ اقبال کا ایک دور ختم ہوتا ہے اس کے بعد بھارت اور پاکستان میں مطالعۂ اقبال کی جہتوں نے ایک دوسرے سے قدرے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔ ''بھارت میں مطالعۂ اقبال'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون ہماری کتاب اقبالیاتی جائزے [لاہور، ۱۹۹۱ء] میں شامل ہے۔

''اقبالیاتِ پاکستان'' پر ذیل میں چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی تحریروں، خصوصاً خطبۂ الٰہ آباد اور محمد علی جناح کے نام خطوط میں، ہندی مسلمانوں کے لیے ہندستان کے شمال مغربی خطے میں ایک علاحدہ وطن کی تجویز و تمنا کا اظہار کیا تھا۔ گو، انھوں نے اس کے لیے کوئی نام تجویز نہیں کیا، مگر ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہونے والی مملکتِ خداداد...... پاکستان...... علامہ اقبال ہی کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ علامہ اقبال کی حیثیت بھی، فکری اعتبار سے، بانیٔ پاکستان ہی کی ہے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں کے سیاسی، تعلیمی اور علمی و ادبی حلقوں میں ذکرِ اقبال اور مطالعۂ اقبال کی جانب ایک رغبت و اعتنا بالکل فطری بات تھی۔ اقبال کی تعریف و تحسین کے ساتھ، ان پر ادبی نقد و انتقاد،

کلامِ اقبال کی توضیح وتشریح اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہونے لگے۔ اس طرح اقبالیات، ایک علمی و ادبی شعبے کی حیثیت سے رُو پذیر ہونا شروع ہوا۔ محدود پیمانے پر ۱۹۷۳ء میں اقبال کا صد سالہ یوم ولادت منایا گیا۔[۶] بعد ازاں جب حکومت پاکستان نے سال ۱۹۷۷ء کو ''اقبال صدی'' کا نام دیا تو نہ صرف پاکستان، بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں مطالعۂ اقبال کے رجحان میں اضافہ ہونے لگا۔

حکومت پاکستان کی سر پرستی میں لاہور میں، ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء، پہلی عالمی (اور تا حال تاریخِ اقبالیات کی سب سے بڑی) اقبال کانگرس منعقد ہوئی۔ سال اقبال کے دوران میں تعلیمی اور علمی اداروں میں وسیع پیمانے پر تقریبات منعقد ہوئیں۔ ملک میں ایک عمومی اقبالیاتی فضا پیدا ہوتی گئی۔ ہمارے اہل قلم اور ناشرین نے بھی محسوس کیا کہ اقبالیات ایک پُرکشش موضوع ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں اقبالیاتی ادب کا ایک سیلاب امڈ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے رطب و یابس کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اقبالیات پر چھوٹی بڑی کتابوں، جامعات کے تحقیقی مقالوں اور مجلّات کے خاص اقبال نمبروں کی تعداد دو ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے۔ رسائل و اخبارات میں شائع ہونے والے ہزارہا مضامین و مقالات ان کے علاوہ ہیں۔ اس بحرِ زخّار کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ''اقبالیاتِ پاکستان'' کا ہے۔ یوں اردو ادب کی اس نئی اور نوخیز صنف ادب ''اقبالیات'' نے اردو کی دیگر اصناف کے مقابلے میں نسبتاً ایک مختصر عرصے میں، حیرت انگیز برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اقبالیات کی اس سریع فروغ پذیری کو علامہ اقبال کی طلسماتی شخصیت کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ عبدالقادر جس ''مسٹر محمد اقبال، ایم اے'' کو بطور ایک شاعر اردو دنیا میں متعارف کرا رہے تھے، ایک صدی بعد، آج انھیں اردو یا کم از کم بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے۔

ساٹھ برسوں میں اقبال کے تعلق سے وجود میں آنے والا ''اقبالیاتی ادب'' مختلف النوع اور ہمہ گیر ہے اور کثیر الاطراف بھی۔ اس کی حدود خاصی وسیع ہیں۔ اگر صرف ذخیرۂ کتب و رسائل ہی کو دیکھیں تو اس کے تنوع، ہمہ جہتی اور وسعت کا اندازہ ہو جائے گا۔ مثلاً:

۱- علامہ اقبال کے متداول اور متروک کلام کے مجموعے اور نثری متون
۲- نظم و نثرِ اقبال کے تراجم
۳- حوالہ جاتی کتابیں (فرہنگیں۔ کتابیات۔ اشاریے)
۴- سوانح اور شخصیت پر کتابیں اور ملفوظات کے مجموعے
۵- اقبال کے افکار و تصورات، فکر و فن اور فلسفے پر تحقیقی و توضیحی اور تنقیدی کتابیں اور مباحث

۶- یونی ورسٹیوں کے امتحانی تحقیقی مقالے

۷- کلامِ اقبال کی شرحیں

۸- اقبال پر منظوم کتابیں

۹- متفرق کتابیں (بچوں کے لیے کتابیں، نصابی کتابیں، سوونیر، کوئز کتابیں وغیرہ)

۱۰- علمی و ادبی رسائل کے اقبال نمبر

اس طرح اقبالیات کا تحریری ذخیرہ کم و بیش دس شاخوں میں پھیلا ہوا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں اقبالیات کے ان دسیوں پہلوؤں پر بہت کچھ شائع ہوا ہے اور یہ سب شاخیں خوب برگ و بار لائی ہیں۔ ۶۰ برسوں کا جائزہ بھی اقبالیات کے انھی عناوین و دوائر میں مناسب و بامعنی ہوگا۔

اقبالیات کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالنے سے قبل، یہ بتانا ضروری ہے کہ اقبالیاتِ پاکستان کی نصف صدی میں کچھ ایسے اقبالیاتی مصادر منصۂ شہود پر آئے ہیں جو اقبالیات میں بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مآخذ اس عرصے کی اہم ترین دریافت و بازیافت ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

۱- اقبال کی قلمی بیاضیں اور مختلف شعری مجموعوں کے مسودات

۲- اقبال کے دست نوشت (hand-written) نثری مسودے

الف: خطبۂ علی گڑھ: The Muslim Community

ب: اقبال کی موعودہ تصنیف تاریخ تصوف کے چند ابواب

ج: ایک انگریزی مضمون بہ عنوان: Bedil, in the Light of Bergson

د: ایک ورق بعنوان: The Problem of Time in Muslim Philosophy

ہ: اقبال کی نوٹ بک: *Stray Reflections*

و: سیکڑوں اردو اور انگریزی خطوط (جن میں بڑی تعداد تو مولانا گرامی، چودھری محمد حسین، راغب احسن اور مہاراجا کشن پرشاد کے نام خطوں کی ہے۔ متفرق خطوط بھی خاصی تعداد میں سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اقبال کے دست نوشت ہیں۔)

اقبالیات میں متذکرہ بالا بنیادی مآخذ کی قدر و قیمت محتاج وضاحت نہیں۔ ان کی بنیاد پر علامہ اقبال کے متداول شعری متون کی تصحیح، متروکاتِ شعری کی مختلف صورتوں کا تعین، اردو اور انگریزی نثر اور خطوط کی اصل نوعیت واضح ہوگئی ہے۔ اب متون اقبال کی تصحیح اور تہذیب و تدوین، نیز ان پر تحقیق زیادہ آسان ہوگئی ہے، اور ان سمتوں میں اقبال شناسوں نے کام کا آغاز کر دیا ہے۔

مآخذ ہی کے ضمن میں، اس عرصے میں اقبال کی سوانح اور شخصیت سے متعلق بہت سی معاصر روایات فراہم ہوئی ہیں۔ ان میں نذیر نیازی، خواجہ عبد الوحید، غلام رسول مہر، عبد المجید سالک، پروفیسر حمید احمد خاں، م ش، صوفی تبسم اور بعض دیگر معاصرینِ اقبال کی شہادتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ مزید برآں معاصر اخبارات و رسائل میں مطبوعہ لوازمہ بھی قابل توجہ ہے، خصوصیت سے اقبال کے بیانات اور تقاریر اور ان کی سوانح سے متعلق معلومات، جنھیں زیادہ تر محمد عبد اللہ قریشی اور محمد حمزہ فاروقی نے قدیم اخبارات و رسائل سے تلاش واخذ کر کے کتابی صورت میں مدوّن و مرتب کر دیا ہے۔

اب ہم شعبہ وار، ۶۰ سالہ اقبالیاتی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہیں:

۱

علامہ اقبال کی شہرت و مقبولیت کی بنیاد ان کی اردو اور فارسی شاعری پر ہے۔ ان کے شعری مجموعے ہمیشہ ہی ''بہترین فروخت'' (best-seller) کے درجے پر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کی تقطیع، کتابت، اور طباعت و اشاعت کا جو انداز و آہنگ متعین و مقرر کیا تھا، ایک عرصے تک ان کے تمام شعری مجموعے اسی نہج پر شائع ہوتے رہے، مگر لیتھو کی فرسودہ طباعت زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکی۔ تقریباً ۲۵ برس بعد، ڈاکٹر جاوید اقبال نے غلام رسول مہر کی نگرانی میں محمود اللہ صدیقی سے پورے کلام کی از سرِ نو کتابت کرائی اور ۱۹۷۳ء میں بڑے اہتمام سے اردو اور فارسی کے الگ الگ مجموعے اور کلیات بھی شائع کیے گئے۔ (شیخ غلام علی اڈیشن) متن کی متعدد اغلاط، ترتیب و تدوین کی بعض خامیوں، چند ایک ضروری وضاحتی اشارات کی عدم موجودگی اور اشاریوں میں بہت سے نقائص کے باوجود، کلامِ اقبال کی اشاعت کے ضمن میں، یہ ایک قابل قدر پیش رفت تھی۔ خصوصاً کلیات اردو اور کلیات فارسی کی شکل میں سارے کلام کی یک جلدی اشاعتیں، ایک مستحسن اقدام تھا۔[۷]

دوسری بڑی اہم (اور نازک تر) پیش رفت کا آغاز اس وقت ہوا جب ۲۱/اپریل ۱۹۸۸ء کے بعد سے، کلامِ اقبال کے ''حقوقِ اشاعت محفوظ'' کی پچاس سالہ میعاد پوری ہوئی۔ اب ہر ناشر کلامِ اقبال چھاپنے میں آزاد تھا۔ اس کا مثبت پہلو تو یہ ہے کہ ناشرین کے درمیان باہمی تجارتی مسابقت کی وجہ سے کلامِ اقبال کے اردو مجموعے کم قیمت پر دستیاب ہونے لگے۔ اقبال اکادمی نے بھی نئی کتابت میں کلیات اردو کے کئی خوب صورت (ڈی لکس، سپر ڈی لکس اور ارزاں عوامی) اڈیشن شائع کیے۔ سپر ڈی لکس اڈیشن، نہایت حسین اور دیدہ زیب ہیں۔ رشید حسن خاں کے بقول: ''اس کے صفحات کے حواشی ایسی گل کاری اور رنگ آمیزی سے مزین ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہو''۔[۸]

اسلم کمال کا گراں قیمت مصور کلیات بھی چھپا۔ کلام اقبال کی اس اشاعتِ عام کا ایک منفی پہلو یہ سامنے آیا کہ بعض غیر ذمہ دار ناشرین نے کلامِ اقبال میں من مانے تحریفات و تصرفات کر ڈالے۔ ایک ناشر[9] نے تو بڑا ستم ڈھایا۔ بانگِ درا کا دیباچہ اڑا دیا، ترتیب کلام بدل ڈالی، ادوار کی حد بندی ختم کر دی اور لاپروائی کی انتہا یہ کہ کلام کا کچھ حصہ کلیات اردو سے حذف کر دیا۔[10]

کیا اقبال کے پاکستان میں کسی ''مقتدرۂ اقبالیات'' کا قیام ممکن نہیں جو اقبال کا استحصال کرنے والوں کا محاسبہ کرے؟

صحتِ کلام کے لحاظ سے اقبال اکادمی کا تیار و شائع کردہ نسخہ بہتر ہے۔ اس کے عوامی اڈیشن (۱۹۹۴ء) پر ''اغلاط سے پاک نسخہ'' کے الفاظ درج کیے گئے تھے (جو درست نہیں تھے) اب انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔ اس نسخے کی کتابت برعظیم کے اکثر قارئین کے لیے مانوس اور دل کش نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں شیخ غلام علی اڈیشن کی کتابت زیادہ خوب صورت اور نظر افروز ہے۔ اگر اس نسخے کی:

۱- اغلاطِ متن و املا درست کر لی جائیں۔
۲- بال جبریل میں غزلیات و قطعات کی اصل ترتیب بحال کر دی جائے۔
۳- موجودہ اشاریے کی جگہ ایک نیا اور صحیح اشاریہ شامل کیا جائے۔

تو یہ ایک اچھا، معیاری اور مستند اڈیشن ہے۔

بازار میں، کلامِ اقبال کے نوع بہ نوع نسخوں اور اشاعتوں کی کمی نہیں، اس کے باوجود، جناب رشید حسن خاں کے بقول: ''ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ اقبال کو بہت کچھ ماننے کے باوجود، ان کے کلام کا کوئی تحقیقی اڈیشن اب تک مرتب نہیں ہو پایا ہے''۔[11] اور یہ ایک ایسی کمی ہے جس پر جتنا بھی اظہار افسوس کیا جائے، کم ہے۔

جہاں تک فارسی کلیات کا تعلق ہے، اقبال اکادمی کے نسخے میں جدید ایرانی املا اختیار کیا گیا ہے۔ اس نظام میں غنہ آوازیں نہیں ہیں اور یاے معروف و مجہول اور واو معروف و مجہول کی تفریق بھی ختم ہو گئی ہے، صرف معروف آوازیں باقی رہ گئی ہیں۔ اول تو یہ اقبال کے طرزِ نگارش کے خلاف ہے: دوسرے ایرانی قارئین کے لیے تو یہ نسخہ ٹھیک ہوگا، مگر برعظیم پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے قارئین کے لیے یہ انداز کتابت بہت نامانوس اور اجنبی ہے اور الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہاں شیخ غلام علی اڈیشن ہی، اغلاط کی تصحیح کے بعد، رائج رہنا چاہیے، اور اردو کلیات کی طرح فارسی کلیات کا بھی ایک تحقیقی اڈیشن مرتب ہونا ضروری ہے۔

اقبال کے متروک کلام پر ان کی بیاضوں، مسودوں اور دیگر مآخذ کی مدد سے ایک قابل قدر کام ڈاکٹر صابر کلوروی کا ہے۔ (ڈاکٹریٹ کا غیر مطبوعہ مقالہ بہ عنوان: باقیات شعرِ اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

اب انھوں نے وسیع تر مآخذ کی بنیاد پر کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال مرتب اور شائع کر دیا ہے۔ (اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۴ء) جو باقیات و متروکات اقبال کے تمام مجموعوں اور غیر مدوّن متروک کلام کا جامع ہے۔

اقبال کے انگریزی خطبات (*Reconstruction*) ان کی نثر کی مشکل ترین کتاب ہے۔ پروفیسر محمد سعید شیخ نے برسوں کی محنت کے بعد، اسے ایک قابل رشک معیار پر مرتب کیا ہے (۱۹۸۶ء)۔ متن کی صحت، حوالوں کی تلاش و تصحیح، اقتباسات کے تعین و تخریج اور حواشی و تعلیقات کے کام میں انھوں نے جس دیدہ ریزی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے، ایسی محنت و کاوش اقبال کے کسی اور متن کی تدوین پر نہیں کی گئی۔ یہ ایک معیاری و مثالی تحقیقی اڈیشن ہے[۱۲]، جسے اقبالیات کے تدوینی کاموں میں نشانِ راہ بنایا جا سکتا ہے۔

ایک اور اچھی تدوین، اقبال کے ایک نو دریافت انگریزی مضمون Bedil, in the Light of Bergson کی صورت میں سامنے آئی (۱۹۸۶ء)۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال میوزیم سے اس غیر مطبوعہ مقالے کا دست نوشت مسودہ تلاش کر کے دقّتِ نظر سے اسے پڑھا، پھر متن کو اردو ترجمے، حواشی اور ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ مطالعہ بیدل، برگساں کی نظر میں کے نام سے شائع کیا۔[۱۳] علامہ نے The Problem of Time in Muslim Philosophy کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ اس کے معدوم متن کا صرف ایک ہی ورق دستیاب ہوا، اسے بھی ڈاکٹر تحسین فراقی نے ترجمہ و توضیحات کے ساتھ مرتب کر دیا۔[۱۴] اقبال کی موعودہ تصنیف تاریخ تصوف کے دو ابواب کا مسودہ صابر کلوروی کو دستیاب ہوا، جسے انھوں نے تاریخ تصوف کے نام سے بعض حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے،[۱۵] مگر اپنی اس کاوش پر نظر ثانی اور اس مسودے کی مزید بہتر تدوین کلوروی صاحب کے پُرعزم منصوبوں میں شامل ہے۔ خطبۂ علی گڑھ کا پورا متن دستیاب نہ تھا۔ اسے راقم نے جاوید منزل سے بازیافت کر کے ۱۹۸۰ء میں اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ پیش کیا۔ اس پر علامہ کا دست نوشت تمہیدی نوٹ، بسلسلۂ قادیانیت، خاص اہمیت رکھتا ہے۔[۱۶] علامہ اقبال ۱۹۱۰ء میں ایک نوٹ بک میں بعض شذرات لکھتے رہے، ان شذرات کو انھوں نے *Stray Reflections* کا نام دیا۔ اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا کے سلسلے میں یہ نوٹ بک اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ حال ہی میں خرم علی شفیق نے اسے ایک بہتر اور اطمینان بخش ترتیب کے ساتھ مدوّن کیا ہے۔ (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء)

اقبال کی مطبوعہ اردو اور انگریزی نثر کے متعدد مجموعے لطیف احمد شروانی، عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی، شاہد حسین رزاقی، رحیم بخش شاہین، محمد رفیق افضل اور زیب النسا نے مرتب کیے ہیں۔ اس نثری ذخیرے کی تحقیقی تدوین باقی ہے۔ اس سمت میں ایک ابتدائی اچھی کوشش اختر النسا کے ایم فل اقبالیات کے تحقیقی مقالے بہ عنوان: گفتار اقبال: متن کا تحقیقی مطالعہ (۱۹۹۶ء) میں نظر آتی ہے۔

۱۹۴۷ء تک خطوطِ اقبال کے دو اردو مجموعے (اقبال نامہ، اول: شیخ عطاء اللہ اور شاد اقبال: محی الدین قادری زور) شائع ہوئے تھے۔ ایک مختصر مگر گراں قدر انگریزی مجموعہ *Letters of Iqbal to Jinnah* بھی چھپ چکا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، اس نصف صدی میں خطوطِ اقبال کے ضمن میں بھی خاصا کام ہوا ہے۔ اقبال نامہ کا دوسرا حصہ، نیز: نذیر نیازی، خان محمد نیاز الدین خاں، مولانا گرامی، راغب احسن اور سید سلیمان ندوی کے نام خطوں کے مجموعے چھپے۔ متفرق مکاتیب کے بعض مجموعے بھی (انوار اقبال از بشیر احمد ڈار، خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی) اور *Letters of Iqbal*۔ محمد عبداللہ قریشی نے شاد اقبال کو اضافوں کے ساتھ اقبال بنام شاد کے نام سے شائع کیا۔ اس عرصے میں سیکڑوں غیر مدون (ان میں سے بہت سے غیر مطبوعہ) خطوط دریافت و بازیافت ہو کر سامنے آئے اور ان پر تحقیقی کام بھی ہوا۔ (تدوین کار: افضل حق قرشی، رحیم بخش شاہین، صابر کلوروی، شیخ اعجاز احمد، سید شکیل احمد، اخلاق اثر، تحسین فراقی، جہانگیر عالم اور رفیع الدین ہاشمی وغیرہ)

خطوطِ اقبال میں ایک اہم اضافہ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اور دوسرا ثاقف نفیس نے کیا۔ اقبال کی جرمن ٹیوٹرمس ایما ویگے ناسٹ کے نام، اقبال کے جرمن اور انگریزی خطوط، جرمن نومسلم محمد امان ہو بوہوم کی تحویل میں تھے جنھیں درانی صاحب بڑی کاوش و محنت سے، اُردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ مدون کر کے منصۂ شہود پر لائے۔ چودھری محمد حسین کے نام غیر مطبوعہ خطوطِ اقبال کا ایک ذخیرہ، ان کے پوتے ثاقف نفیس نے اپنے ایم اے اردو کے تحقیقی مقالے کے ذریعے منکشف کیا ہے۔[۱۷] اقبال کی شخصیت کی تفہیم کے ضمن میں یہ دونوں ذخیرے بہت اہم ہیں۔ اہمیت کے لحاظ سے وہ خطوط بھی گراں قدر ہیں جن کے بعض حصے حذف کر کے شیخ اعجاز احمد نے مظلوم اقبال اور ان کے کچھ اہم اقتباسات جاوید اقبال صاحب نے زندہ رود میں شامل کیے ہیں۔[۱۸] اسی طرح سید شکیل احمد (اقبال: نئی تحقیق، حیدر آباد دکن، ۱۹۸۵ء) کے دریافت کردہ اکبر حیدری کے نام وہ خطوط بھی جن سے، اپنے والد سے آفتاب اقبال کے تعلقات کی خرابی کی وجوہ سامنے آتی ہیں۔

راقم الحروف نے ۱۹۷۶ء میں خطوطِ اقبال کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کے لیے چند تجاویز پیش کی تھیں (مقدمہ: خطوط اقبال، ص۴۴، ۴۵) دوبارہ ۱۹۸۰ء میں کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کی تدوین کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ (تصانیف اقبال، ص۲۷۲ تا ۲۷۶) یہ تجویز سید مظفر حسین برنی کے ہاتھوں روبعمل آئی۔ انھوں نے اقبال کے ۱۵۷۷ دستیاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ مکاتیب کو چار جلدوں میں شائع کیا۔[۱۹] تدوینِ مکاتیب میں متن کی تحقیق اور صحت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ برنی صاحب کے کلیات کا یہی پہلو سب سے کمزور ہے۔[۲۰]

بہر حال مکاتیب کی فراہمی و جمع آوری کی متذکرہ بالا کوششوں کے نتیجے میں تقریباً سولہ سترہ سو خطوط سامنے آ چکے ہیں مگر یہ مرحلۂ اول ہے۔ اصل کام ان خطوں کی تحقیقی تدوین ہے۔ اس کے بغیر ذخیرۂ

مکاتیب کو جعلی منسوبات (مثلاً: لمعہ حیدر آبادی) سے محفوظ رکھنا مشکل ہوگا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال نامہ اول کے متن کی تصحیح کا کام مکمل کر لیا ہے۔ خطوطِ اقبال کی یہ جلد، شائع ہونے پر، مکاتیب کی تحقیقی تدوین کے لیے ایک نمونے کا کام دے گی۔ اس اثنا میں جناب مختار مسعود نے اقبال نامہ کے دونوں حصے یکجا شائع کیے ہیں، مگر افسوس ہے کہ متن کی تصحیح پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ اقبال نامہ کے اس اڈیشن (اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۵ء) میں لمعہ حیدر آبادی کے نام اقبال کا صرف ایک خط شامل ہے، ان کے نام باقی خطوط کو مشکوک قرار دے کر خارج کر دیا گیا ہے۔ خطوط کی اصلیت واستناد کے ضمن میں، بھوپال کے ماسٹر اختر صاحب کی تحقیقات قابلِ توجہ ہیں اور احساس دلاتی ہیں کہ اقبال سے منسوب خطوں کو قبول کرنے میں حد درجہ محتاط رہنا چاہیے۔[۲۱]

مکاتیبِ اقبال کی اطمینان بخش تدوین، ایم فل اقبالیات کے تین مقالات کی صورت میں سامنے آئی ہے:

۱- مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خاں، تعلیقات وحواشی از عبداللہ شاہ ہاشمی ۱۹۹۳ء

۲- اقبال: جہانِ دیگر، حواشی وتعلیقات از محمد صدیق ظفر [حجازی] ۱۹۹۷ء

۳- انوارِ اقبال (خطوط)، ترتیب وتحشیہ از زیب النساء، ۱۹۹۸ء

تدوینِ خطوط کے ضمن میں تینوں کاوشوں کو اچھی پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نمبر ۱ نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۶ء) اور نمبر ۲ اور ۳ نظر ثانی کے مرحلے میں ہیں۔

متفرق خطوط کی دریافت و باز یافت کا سلسلہ جاری ہے۔ وقتاً فوقتاً اِکّا دُکّا خطوط اب بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے اردو مجلّے اقبالیات میں اقبال کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ اقبال ریویو (حیدر آباد دکن، اپریل ۲۰۰۶) میں اقبال کے حیدر آبادی معاصرین (عبداللہ عمادی، ابوظفر عبدالواحد، غلام دستگیر رشید اور ڈاکٹر سید عبداللطیف) کے نام ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط یکجا کیے گئے ہیں۔

۲

علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے: ''میں ذاتی طور پر ترجموں کا قائل نہیں ہوں''۔ ان کے خیال میں ترجمے کے ''نہایت مشکل کام'' سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔[۲۲] اس کے باوجود بعض نے تو از راہِ عقیدت مندی اور بعض نے بطور مشق فارسی کلام کو اردو نظم ونثر میں منتقل کیا (عبدالرحمٰن طارق، محمد عبدالرشید فاضل، ایس اے رحمٰن، انعام اللہ خاں ناصر، نظیر لدھیانوی، کوکب شادانی، صوفی تبسم، فیض احمد فیض، حضور احمد

سلیم) مہر تقوی جے پوری، رفیق خاور، عبدالغفور اظہر، گل بادشاہ، شریف کنجاہی، مسعود قریشی، عبدالعلیم صدیقی، انجم رومانی، محمد زمان مضطر، ولایت علی شاہ، ظہیر احمد صدیقی وغیرہ)۔ اس کے برعکس بعض اصحاب (آفتاب اصغر، عبدالحمید عرفانی، مقبول الٰہی اور رفیق خاور) نے اردو کلام کو فارسی نظم میں منتقل کیا ہے۔ تراجم سے اقبالیین کی دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ کلامِ اقبال کے بعض مجموعے کئی کئی زبانوں میں اور بعض زبانوں میں ایک ایک کتاب کے کئی کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ علاقائی زبانوں میں ترجمے نسبتاً زیادہ جوش و خروش اور عقیدت مندی کے ساتھ کیے گئے، مثلاً: پشتو میں اقبال کے تمام اردو اور فارسی مجموعوں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

بعض اصحاب نے فارسی اور اردو کلام کے منظوم اور منثور انگریزی ترجمے بھی کیے (عبدالرحمٰن طارق، شیخ عزیز احمد، رفیق خاور، الطاف حسین، صوفی اے کیو نیاز، اکبر علی شاہ، بشیر احمد ڈار، محمود احمد شیخ، رحمت اللہ، محمد صادق خاں ستی، محمد ہادی حسین، یعقوب مرزا، سعید اختر درانی، ایم اے کے خلیل، اکرام اعظم، جمیل نقوی، خواجہ طارق محمود، سلیم گیلانی، کیو اے کبیر، انیس ناگی، راجا سلطان ظہور اختر، عباس علی جعفری، محمد یوسف [شیخ]، حسن دین، مقبول الٰہی اور مستنصر میر۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے ۲۰۰۱ء میں نکلسن کے ترجمۂ اسرار خودی کا ایک ایسا نسخہ شائع کیا تھا جس میں خود علامہ اقبال کی دست نوشت ترمیمات موجود ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں درانی صاحب نے پروفیسر اے جے آربری کے ترجمۂ گلشن رازِ جدید کو مدوّن کر کے شائع کیا۔ اس ترجمے میں فارسی متن، درانی صاحب کا دیباچہ، آربری کا ترجمہ بعض مصرعوں کا درانی کا متبادل ترجمہ بھی، مختصر توضیحات اور آخر میں آربری (کے ترجمے) کا دست نوشت عکسی مسودہ بھی شامل ہے۔[۲۳]

کلامِ اقبال کا پنجابی ترجمہ جیسا عمدہ اسیر عابد نے کیا (جبریل اڈاری) ویسا کسی اور سے نہیں ہو سکا۔ وہ اردو نظم کو پوری معنویت و مفہوم کے ساتھ پنجابی نظم میں منتقل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے۔ علاقائی زبانوں میں تراجم اقبال، مختلف اصحاب کے مرہون منت ہیں۔ (سندھی: لطف اللہ بدوی، عبدالغفار ایم سومرو، محمد بخش واصف، محمد یوسف [شیخ]...... گجراتی: سید عظیم الدین منادی، خادم کپتانوی...... پشتو: تقویم الحق کاکاخیل، سمندر خاں سمندر، امیر حمزہ شنواری، راحت زاخیلی، عبدالحلیم اثر، شیر محمد مے نوش، عبداللہ جان اسیر، سید الابرار، عبدالمنان...... بنگالی: محمد شہید اللہ، علی احسن، سید عبدالمنان، میزان الرحمٰن، عبدالرشید خان، منیر الدین یوسف، نورالاسلام، غلام صمدانی قریشی، غلام مصطفےٰ کوی، کمال الدین خاں، مقدس علی، سیف الرحمٰن، سلطان احمد میرزا، فرخ احمد، ابوالحسنات محمد کلیم اللہ، ابراہیم خاں، عبدالمنان طالب، ابوضحیٰ نور احمد، محمد عبدالحق فریدی...... پنجابی: عبدالغفور اظہر، خلیل آتش، قریشی احمد حسین قلعداری، شریف کنجاہی، علی احمد گوندل، اختر حسین شیخ، عبدالمجید خاں ساجد، سید منظور حسین، تنویر بخاری، اسیر عابد، صوفی تبسم، علی اکبر عباس، ماسٹر کاظم علی اور منظور حیدر...... سرائیکی: مہر عبدالحق، نسیم لیہ، ایاز سہروردی...... بلتی: شمیم بلتستانی......

کشمیری: غلام احمد ناز...... : بلوچی: غوث بخش صابر...... براہوی: پیر محمد زبیرانی، ظفر مرزا...... گجراتی: سید عظیم الدین مغادی۔

فارسی کلیات کا مکمل اردو نثری ترجمہ میاں عبد الرشید نے کیا، اور اب مکمل منظوم ترجمہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی نے شائع کیا ہے۔[۲۴] آقا بیدار بخت، الٰہی بخش اعوان، اقبال احمد خاں، ڈاکٹر الف د نسیم، مخدوم غلام جیلانی، احمد جاوید، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، صبغت جالندھری، ڈاکٹر محمد ریاض (باشتراک سعادت سعید)، اور طاہر شادانی (باشتراک ضیا احمد ضیا) نے بھی متفرق نثری تراجم کیے۔ حال ہی میں حمیداللہ شاہ ہاشمی نے بھی فارسی کلیات کا اردو نثری ترجمہ شائع کیا ہے۔ (مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۷ء) بایں ہمہ مکمل فارسی کلام کے ایک عمدہ بامحاورہ نثری ترجمے کی ضرورت ختم نہیں ہوئی۔

اقبال کے پورے انگریزی خطبات کا سب سے معروف اور اولین ترجمہ تو نذیر نیازی کا ہے، بعنوان: تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (۱۹۵۸ء) جو بعض خامیوں کے باوجود، اب بھی ایک بہتر ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ شریف کنجاہی نے کیا بعنوان: مذہبی افکار کی تعمیر نو (۱۹۹۲ء)۔ تیسرا ترجمہ شہزاد احمد کا ہے: اسلامی فکر کی نئی تشکیل [۲۰۰۰ء] اور چوتھا وحید عشرت کا بعنوان: تجدیدِ فکریاتِ اسلام (۲۰۰۲ء)۔[۲۵] بعض اصحاب نے اِکّا دُکّا خطبوں کے ترجمے کیے ہیں، مثلاً حافظ ضمیر الدین، اختر مسعود، پروفیسر خورشید احمد وغیرہ۔

انگریزی تقاریر و بیانات کا ایک اردو ترجمہ تو حرف اقبال (۱۹۴۵ء) لطیف احمد شیروانی (شاملو) کا ہے۔ دوسرا ترجمہ اقبال احمد صدیقی نے علامہ اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات کے نام سے کیا۔ (اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۹ء) چند منتخب انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد ریاض نے بعنوان: افکارِ اقبال (۱۹۹۰ء) شائع کیا۔ خطبۂ علی گڑھ کے متعدد اردو تراجم چھپے ہیں: شاہد اقبال کامران کا ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ (۱۹۸۹ء)، اسی عنوان سے جہانگیر عالم کا ترجمہ مشمولہ در: خطبات اقبال (۲۰۰۱ء) اور عبدالجبار شاکر کا ''ملتِ اسلامیہ: ایک عمرانی مطالعۂ، مطبوعہ: دعوۃ، اقبال نمبر، نومبر دسمبر ۲۰۰۷ء۔ *Stray Reflections* کا بہت عمدہ ترجمہ افتخار احمد صدیقی نے، اور خطوط بنام جناح کا جہانگیر عالم نے کیا۔ تحسین فراقی نے ایک اہم انگریزی مضمون کا خوب صورت اردو ترجمہ مطالعۂ بیدل: فکر برگساں کی روشنی میں کے عنوان سے شائع کیا (اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء و مابعد)۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بیشتر تراجم پر نظر ثانی کی گنجایش موجود ہے اور نئے تراجم کی ضرورت بھی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

۳

ایک بار ڈاکٹر سید عبداللہ (م: ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء) نے شکوے کے انداز میں لکھا تھا:

اگر ہم سچ مچ اقبال کو اپنی ذہنی تاریخ میں وہی درجہ دیتے ہیں جو انگریزوں اور جرمنوں نے شیکسپیر اور گوئٹے کو دے رکھا ہے تو ہم ان کے ساتھ اپنی محبت اور ان کے اعتراف کے بارے میں شرمندہ ہونے پر مجبور ہوں گے۔ انگریزی اور مغربی ادب کے واقف کاروں سے وہ طویل و ضخیم اسماء الکتب (Bibliographies) پوشیدہ نہیں ہیں، جن میں شیکسپیر اور گوئٹے کے متعلق کتابیں شامل ہیں۔[۲۶]

سید صاحب نے یہ بات ۱۹۴۰ء میں کہی تھی لیکن آج ہمیں اس باب میں شرمندگی کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس عرصے میں علامہ اقبال پر خاصا حوالہ جاتی کام ہوا ہے۔ محدود نوعیت کی فہارسِ کتب اور مضامین (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، جمیل رضوی، معین نواز، اختر النسا، قمر عباس، ندیم شفیق ملک، شازیہ ظہیر خواجہ، نجف علی، حمیرا ظفر) کے علاوہ حوالہ جاتی تحقیق کے سلسلے میں چند عمدہ اشاریے اور جامع کتابیات بھی تیار ہو چکی ہیں۔ تلاشِ ابیات کے لیے جوئے شیر (داؤد عسکر، ۱۹۷۹ء)، مجلسِ اقبال (پیر عبداللطیف نقش بندی، ۱۹۹۵ء)، اشاریہ کلامِ اقبال، فارسی (زبیدہ بیگم، ۱۹۹۶ء)، اشاریہ کلیات اقبال، اردو (یاسمین رفیق، ۲۰۰۱ء) اور اسی نام سے ایک اور اشاریہ از زبیدہ بیگم (۲۰۰۲ء)، اشاریہ کلیاتِ باقیات شعر اقبال (سمیرا نسرین ۲۰۰۶ء)، کلامِ اقبال کی تراکیب و الفاظ کے لیے کلید اقبال، اردو (یونس حسرت، ۱۹۸۶ء) مفید اشاریے ہیں۔ کلیاتِ اقبال فارسی کا ایک کثیر الاطراف اشاریہ ساجد اللہ تفہیمی نے مرتب کیا: کشف الالفاظِ اقبال، (کراچی، ۲۰۰۲ء)۔ تلاشِ ابیات کے ساتھ ساتھ یہ کتاب الفاظ، تراکیب اور مصادر و افعالِ مرکب کے استعمال کی کلید بھی ہے۔ اسی طرح خطوط کے لیے اشاریہ مکاتیب اقبال، (صابر کلوروی، ۱۹۸۴ء)۔ اقبال کی تصانیف اور ان پر کتابوں کی توضیحی ببلوگرافی: کتابیات اقبال، (رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۷۷ء) ۲۰۰۶ء تک کے حوالوں کے ساتھ راقم ہی کی مرتبہ اس طرح کی ایک نئی کتاب حوالہ زیرِ اشاعت ہے۔ حوالہ جاتی کتابوں میں محمد صدیق کی *Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library* (۱۹۸۳ء) اور ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی اوزانِ اقبال (۱۹۸۳ء) بھی اہم ہیں۔ نسیم فاطمہ کی آئینۂ ایامِ اقبال (۱۹۷۷ء)، ہارون الرشید تبسم کی حیاتِ اقبال کا سفر (۱۹۹۲ء) اور اقبال اکادمی کی اقبال: سنین کے آئینے میں (۱۹۹۹ء) علامہ کے احوال و واقعات کو ترتیب زمانی سے پیش کرتی ہیں۔ یونی ورسٹیوں کے تحقیقی مقالات کی شکل میں بھی بعض علمی مجلوں (اقبال، اقبال ریویو، نقوش، سیارہ، اورینٹل کالج میگزین، نقد و نظر (علی گڑھ) میں شائع شدہ لوازمۂ اقبالیات کی فہارس تیار

ہوئی ہیں۔ حال ہی میں محمد شاہد حنیف نے بعض مجلّات کے ذخیرۂ اقبالیات کی فہارس (اشاریے) مرتب و شائع کرنا شروع کیے ہیں۔[۲۷] اقبال اور اقبالیات سے متعلق شخصیات پر دو کتابیں: رجال اقبال (عبدالرؤف عروج، ۱۹۸۸ء) اور معاصرین اقبال (فیوض الرحمٰن، ۱۹۹۳ء) مفید معلومات فراہم کرتی ہیں، البتہ اقبال انسائی کلو پیڈیا کے ضمن میں ملک حسن اختر (م: ۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء) کی انفرادی کوشش (دائرہ معارف اقبال، ۱۹۷۷ء) معیار سے فروتر رہی۔ اس ضمن میں حال ہی میں پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات نے دائرہ معارفِ اقبال کی پہلی جلد (''الف'' سے ''ث'' تک) شائع کی ہے (۲۰۰۶ء) جو اقبالیات کے بعض اہم عنوانات پر مختلف اہل قلم کے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔

ندیم شفیق ملک نے پاکستان کے انگریزی اخبارات میں اقبالیات (مقالات، مذاکرے، مراسلے، خبریں وغیرہ) کا جائزہ، اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے: (*Perception of Life and Works of Allama Iqbal in Pakistani English Journalism: A Survey of English Dailies*)

اقبالیاتی ادب میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے، اس کے تجزیے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مطالعہ اقبال کی ابتدائی کاوشوں اور اس ضمن میں مزید تحقیقی و تنقیدی کاموں کی ضرورت اور اہم موضوعات اور ''مہماتِ امور'' کی نشان دہی سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون ''کلامِ اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت'' مطبوعہ معارف اعظم گڑھ (مارچ ۱۹۴۴ء) میں کی تھی۔ کتابی صورت میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (۱۹۵۵ء) اس سلسلے کی اولین علمی کاوش تھی۔ ۱۹۶۶ء میں مشفق خواجہ نے اپنے مضمون ''اقبال پرستی سے اقبال شناسی تک'' میں توجہ دلائی کہ اقبالیات کی بعض خاص سمتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔[۲۸] پھر راقم الحروف نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سب سے پہلے تو ''۱۹۸۴ء کے اقبالیاتی ادب کا جائزہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا (مطبوعہ: اقبالیات، لاہور، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء، نیز مشمولہ: اقبالیاتی جائزے) بعد ازاں حسب ذیل جائزے کتابی صورت میں شائع کیے:

۱- ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب: اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶ء

۲- ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب: اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء

۳- اقبالیاتی جائزے: گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۰ء

۴- اقبالیاتی ادب کے تین سال (۱۹۸۷ء-۱۹۸۹ء): الحمرا پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۳ء

افسوس ہے کہ سالانہ اقبالیاتی جائزے کا یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ جاری نہ رہ سکا، البتہ راقم نے

اس سلسلے میں متعدد مضامین تحریر کیے، مثلاً:

۱- پاکستان میں اقبالیاتی ادب [مضمون ہذا کی ابتدائی صورت] مشمولہ: تفہیم و تجزیہ (مجموعۂ مضامین) کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۹۹ء

۲- ۱۹۹۸ء اقبال شناسی کا ایک اہم سال، نوائے وقت لاہور، ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء

۳- اقبال شناسی اکیسویں صدی کے پہلے سال میں: نوائے وقت راول پنڈی، ۷ مئی ۲۰۰۲ء[۲۹]

۴- پاکستانی جامعات میں اقبالیاتی تحقیق: خیابان (نوادر اقبال نمبر) پشاور یونی ورسٹی ۲۰۰۳ء

۵- اقبالیاتی ادب (اردو) ایک مختصر مطالعہ: اقبالیات سری نگر، شمارہ ۱۶، ۲۰۰۶ء

اس نوع کے جائزے حوالے کا کام دیتے ہیں، ان سے اقبالیات کے مختلف رجحانات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کن شعبوں میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ (حوالہ ۲۶) اور مشفق خواجہ (حوالہ ۲۸) کے مضامین اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایک مبسوط جائزہ بعنوان: ''جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید'' (اقبال ریویو، لاہور جولائی ۱۹۸۴ء) بھی لائق مطالعہ ہے۔[۳۰]

۴

باعتبار موضوع، سوانحی کتابیں اقبالیاتی ادب میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ بزم اقبال لاہور نے ابتدا میں اقبال کی سوانح عمری لکھنے کا کام غلام رسول مہر (م: ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) کو سونپا، جو اس علمی خدمت کے لیے موزوں ترین محقق تھے، پھر یہ کام عبدالمجید سالک (م: ۲ نومبر ۱۹۵۹ء) کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کی کاوش ذکر اقبال کے نام سے ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئی۔ قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والی یہ علامہ اقبال کی پہلی باضابطہ سوانح عمری ہے۔ سالک مرحوم کو اقبال کی صحبت و رفاقت حاصل رہی اور انھیں اس موضوع پر غلام رسول مہر کا جمع کردہ بہت سا ضروری لوازمہ بھی دے دیا گیا تھا۔ ذکر اقبال ایک معلومات افزا کتاب ضرور ہے، مگر مصنف کے مخصوص مزاج، بعض ذاتی معتقدات، صحافیانہ افتادِ طبع، ضروری تحقیق و تفحص میں کمی اور عدم احتیاط کے سبب اسے ایک معیاری سوانح عمری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں تاریخی اور واقعاتی غلطیاں ہیں اور ''اقبال کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کے درمیان ربط کا فقدان ہے۔ کتاب ایک کل نہیں، بلکہ الگ الگ ٹکڑوں میں بٹی نظر آتی ہے، نتیجہ یہ کہ کتاب کو پڑھ کر اقبال کی شخصیت کا کوئی نقش نہیں بنتا''۔[۳۱]

آیندہ بیس برسوں میں، اقبالیاتی ادب کے اس اہم شعبے یعنی سوانحِ اقبال کے ضمن میں، ایک سناٹے کی کیفیت طاری رہی۔ اقبال صدی (۱۹۷۷ء) کے موقع پر اقبال کی ایک معیاری اور مستند سوانح عمری کی

کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ ''نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ ولادتِ اقبال'' نے اس مسئلے پر غور کیا اور یہ ذمہ داری سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو سونپی۔ موخر الذکر کی سر گذشتِ اقبال (۱۹۷۷ء) میں، بقول ایس اے رحمٰن: ''حیاتِ اقبال کے ضروری کوائف اجاگر ہو گئے''۔ (دیباچہ) مگر یہ بہت عجلت میں لکھی گئی تھی اس لیے، اس کے بعض حصوں کی مناسب طور پر تسوید نہ ہو سکی، بعض امور تشنہ رہ گئے اور اس میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئیں۔ سر گذشتِ اقبال میں سیاست دان اقبال تو موجود ہے مگر شاعر اقبال اور ملّتِ اسلامیہ کی سر بلندی اور تجلیلِ انسان کے خواب دیکھنے والا اقبال یہاں نظر نہیں آتا۔ مزید برآں اس میں اقبال کی شخصیت اور فن کا پہلو بہت کمزور ہے اور یہ محض اقبال کے خارج کا کوائف نامہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر خورشید ذکرِ اقبال کے سحر سے آزاد ہو کر قلم اٹھاتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ تاہم ان کی کاوش سے علامہ اقبال کے سوانحی ذخیرے میں کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہوئی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے سر گذشت اقبال کا جائزہ لیتے ہوئے، اس پر ایک سخت محاکمہ تحریر کیا۔[۳۲]

سید نذیر نیازی کی دانائے راز (۱۹۷۹ء) ۱۹۰۸ء تک کے حالات پر محیط ہے۔ اس کے بعض ابواب بہت معلومات افزا اور عمدہ ہیں، جیسے: نوجوان اقبال، ازدواج، اور پہلی شادی۔ تشکیلی دور کی بحث بھی مربوط اور مفصل ہے۔ ازدواجی اختلاف ایسے نازک موضوع کو مصنف نے اس متوازن انداز میں سمیٹا ہے کہ اس سے پہلے اقبال کے کسی سوانح نگار سے ایسا ممکن نہ ہوا۔ لیکن اس کتاب کو مناسب تدوین، ابواب بندی اور حوالوں کی تکمیل کے بعد ہی شائع ہونا چاہیے تھا۔

متذکرہ بالا دونوں کتابوں کے مقابلے میں محمد حنیف شاہد کی مفکرِ پاکستان (۱۹۸۲ء) زیادہ ضخیم اور مفصل ہے۔ اس کی جامعیت، مصنف کی محنت و کاوش، تلاش و جستجو اور لوازمے و مسالے کی کثرت قاری کو متاثر بلکہ مرعوب کرتی ہے۔ مصنف نے انجمنِ حمایتِ اسلام کی قلمی رودادوں اور پنجاب گزٹ سے پہلی بار مدد لی ہے۔ معلومات کی فراوانی، اقتباسات کی کثرت اور کوائف کی ثروت کے لحاظ سے بلاشبہ یہ ایک پُر از معلومات کتاب ہے، مگر ایک تو جابجا مصنف کا اِدعا بہت کھلتا ہے، دوسرے: مصنف نے رطب و یابس میں تمیز و تفریق کیے بغیر، جواہر کو خذف ریزوں کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ مواد کی ترتیب و تدوین اور تنظیم ڈھنگ سے نہیں ہو سکی۔ مزید برآں حوالوں کا نظام ابتر اور بے قاعدہ ہے اور تحلیل اور تجزیے اور نقد و انتقاد کی بھی شدید کمی ہے۔ ان وجوہ سے مفکرِ پاکستان میں قاری کے لیے دل کشی کم ہے۔

اسی زمانے میں ایم ایس ناز کی حیاتِ اقبال اور صابر کلوروی کی یادِ اقبال بھی شائع ہوئیں، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال (پ: ۵/ اکتوبر ۱۹۲۴ء) کی زندہ رود (اول: ۱۹۷۹ء، دوم: ۱۹۸۱ء، سوم: ۱۹۸۴ء) اقبال کی جملہ سوانح عمریوں میں برتر اور فائق ہے۔ اس میں اقبال کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان

کے علمی و شعری اور سیاسی کارناموں کا جامعیت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ نجی زندگی سے متعلق بعض بنیادی مآخذ اور بعض نادر دستاویزات و شواہد مصنف کی دسترس میں تھے۔ اپنی نسبی حیثیت کی وجہ سے حیاتِ اقبال کے بعض امور پر بلا خوفِ لومتہ لائم کچھ لکھنا جاوید صاحب کے لیے خاصا مشکل تھا، مگر اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک سوانح نگار کی ذمہ داریوں سے انحراف نہیں کیا، چنانچہ زندہ رود میں ہمیں معروضیت اور توازن نظر آتا ہے۔ یہاں حیاتِ اقبال کے اہم کوائف و حقائق اور واقعات پورے پس منظر و پیش منظر اور تفصیلات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہ حکایت طویل ضرور ہے، مگر اس کی لذت میں کلام نہیں۔ زندہ رود اقبال کی دماغی و ذہنی سرگذشت ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی زندگی، ایک بڑے آدمی اور ایک عظیم انسان کی زندگی تھی۔ اگرچہ زندہ رود اقبال کی سوانح عمریوں میں سب سے بہتر اور جامع ہے، مگر حرفِ آخر یہ بھی نہیں ہے۔ باوجودیکہ مصنف نے زندہ رود پر نظر ثانی کی ہے[۳۳] اس میں بعض خامیاں کھٹکتی ہیں۔ راشد حمید نے زندہ رود کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اسلام آباد، ۲۰۰۷ء) میں ان کی نشان دہی کی ہے، چنانچہ اس پر مزید نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

بعض کتابوں کو اقبال کی ''جزوی سوانح'' کہہ سکتے ہیں، جیسے: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کی اقبال کی ابتدائی زندگی (۱۹۸۶ء) یا ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی عروج اقبال (۱۹۸۷ء)۔ موخر الذکر میں ۱۹۰۸ء تک اختصار و جامعیت سے حیات اقبال کے ضروری کوائف دیے گئے ہیں اور اقبال کا ذہنی و فکری اور شاعرانہ ارتقا بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ اقبال کی ہشت پہلو شخصیت اور ان کے قلب و دماغ اور ذہن و فکر کا ایک عمدہ اور مربوط مطالعہ ہے۔ مصنف کے توازن فکر و نظر کے علاوہ عروج اقبال کی خاص بات مصنف کا دل کش ادبی اور تنقیدی اسلوب ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر ''قومی صدارتی اقبال اوارڈ'' کی مستحق قرار پائی۔ خرم علی شفیق (دما دم رواں ہے یم زندگی، الحمرا، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء) نے اقبال کے سوانح کو اقبال کے ماحول اور زمانے کے قدرے وسیع تناظر میں اور ایک نئے اور منفرد انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ پوری سوانح ۵ جلدوں میں مکمل ہوگی۔

اقبال کی زندگی، شخصیت، ان سے ملاقاتوں کی یادداشتوں اور ان کے ملفوظات پر مشتمل کتابیں بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں۔ ایسی مختلف النوع کتابوں کو اقبال کے سوانحی ذخیرے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اقبال کے سوانح نگار کے لیے ان کی حیثیت ایک ناگزیر لوازمے اور مسالے کی ہے، جیسے: فقیر سید وحید الدین کی روز گار فقیر (اول ۱۹۵۰ء، دوم ۱۹۶۴ء)، سید حامد جلالی کی علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی (۱۹۶۷ء، طبع دوم ۱۹۹۶ء)، سید نذیر نیازی کی اقبال کے حضور (۱۹۷۱ء)، خالد نظیر صوفی کی اقبال درون خانہ [اوّل] (۱۹۷۱ء)، [دوم] (۲۰۰۶ء)، صہبا لکھنوی کی اقبال اور بھوپال (۱۹۷۳ء)، محمد حمزہ

فاروقی کی سفر نامہ اقبال (۱۹۷۳ء)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے (۱۹۸۸ء) اور اقبال کا سیاسی سفر (۱۹۹۲ء)، ڈاکٹر نظیر صوفی کی حیات و پیام علامہ اقبال (۱۹۷۹ء)، رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ (۱۹۷۵ء) اور *Mementos of Iqbal* (۱۹۷۵ء)، محمد حنیف شاہد کی اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام (۱۹۷۶ء) اور علامہ اقبال اور پنجاب کونسل (۱۹۷۷ء)، محمد عبداللہ چغتائی کی اقبال کی صحبت میں (۱۹۷۷ء) اور روایاتِ اقبال (۱۹۷۷ء)، غلام رسول عدیم اور محمد رفیق کی مشترکہ کاوش مزارِ اقبال (۱۹۸۲ء)، محمد عبداللہ قریشی کی حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں (۱۹۸۲ء)، اعجاز احمد کی مظلومِ اقبال (۱۹۸۵ء)، صابر کلوروی کی اقبال کے ہم نشین (۱۹۸۵ء)، ڈورس احمد کی *Iqbal, As I knew Him* (۱۹۸۶ء)، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کی اقبال اور گجرات (۱۹۹۸ء)، سجاد حسین شیرازی کی وفات نامۂ اقبال (۱۹۹۸ء — اقبال کے جنازے کی تفصیل اور نمازِ جنازہ کس نے پڑھائی؟ پر بحث)، جعفر بلوچ کی مجالسِ اقبال (لاہور، ۲۰۰۲ء) اور ڈاکٹر تقی عابدی کی چوں مرگ آید (لاہور، ۲۰۰۷ء)۔ مؤخر الذکر کے سرورق پر یہ توضیحی الفاظ درج ہیں: ''علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص: خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں۔''

اس نوع کی کتابوں میں غلام رسول مہر کا مجموعۂ مضامین اقبالیات بہت اہم ہے۔ مہر صاحب ایک زمانے میں اقبال کی سوانح عمری لکھنے کا عزم رکھتے تھے۔ وہ تو بوجوہ بروے کار نہ آ سکا،[۳۴] مگر ان کے یہ مضامین سوانحی معلومات و ملفوظات کے اعتبار سے بہت اہم ہیں، خصوصاً آخری حصے میں ڈائری کے اندراجات، جن سے اقبال کے فکر و ذہن اور بعض عزائم کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی دو کتابیں: اقبال یورپ میں (۱۹۸۴ء، باضافہ ۱۹۹۹ء) اور نوادرِ اقبال: یورپ میں (۱۹۹۵ء) حیاتِ اقبال کے متعدد نئے گوشے سامنے لاتی ہیں، مثلاً: برطانیہ اور جرمنی میں اقبال کے مختلف تعلیمی مراحل سے متعلق نئی معلومات، خطوط اور نادر دستاویزات، برطانیہ کے کتب خانوں میں موجود تصانیفِ اقبال کے بعض نسخوں پر اقبال کی دست نوشت انتسابی تحریریں، ٹرنٹی کالج کیمبرج، لنکنز اِن اور میونخ یونی ورسٹی کے داخلہ رجسٹروں میں درج اقبال کے بعض اہم کوائف، مجلسِ ممتحنین کی رپورٹیں، اسی طرح جرمنی اور انگلستان میں اقبال کی قیام گاہوں پر انتسابی تختیوں کی تنصیب، کیمبرج میں مسندِ اقبال (Iqbal Chair) کے قیام کے ضمن میں درانی صاحب کی کاوشیں، اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے اصل مسودے کی دریافت اور مطبوعہ کتاب سے اس کا تقابل، ویگے ناسٹ کے نام جرمن اور انگریزی میں اقبال کے چند اہم خطوط کی دریافت وغیرہ۔ اقبال کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کیمبرج میں بی اے کے لیے جو تحقیقی مقالہ لکھا، وہ اس قدر معیاری اور بلند پایہ تھا کہ اس میں معمولی ترامیم کے بعد، میونخ یونی ورسٹی نے انھیں اس

پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی۔ بعض کتابیں سوانح اقبال سے براہ راست متعلق نہیں ہیں، مگر بالواسطہ یا بعض پہلوؤں سے ان کا تعلق علامہ کے حالات سے بنتا ہے، مثلاً سلطان محمود حسین کی شمس العلماء مولوی سید میر حسن (۱۹۸۱ء)، بیگم رشیدہ آفتاب اقبال کی علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال (۱۹۹۹ء) اور اقبال و آفتاب (۲۰۰۲ء)۔

بعض اقبال شناس محققین نے اقبال کے سوانحی ذخیرے پر چند اہم مضامین کے ذریعے قابل قدر اضافے کیے ہیں، مثلاً: ڈاکٹر وحید قریشی (علامہ اقبال کی زندگی کی بعض تفصیلات۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج)۔ ڈاکٹر محمد باقر (اقبال کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ)۔ صفدر محمود (علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی)۔ ملک حسن اختر نے پنجاب گزٹ کے حوالے سے اقبال کی تعلیمی زندگی سے متعلق مفید معلومات مہیا کی ہیں۔[۳۵] نقوش اقبال نمبر ۱، ۲ (ستمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء) میں چند اہم سوانحی مضامین شامل ہیں: ''اقبال کے حضور'' از خواجہ عبد الوحید، ''اقبال کا قیام لاہور'' از حکیم احمد شجاع، ''ایک انٹرویو بسلسلہ اقبال'' از میاں عبد العزیز مالواڈہ، ''اقبال بحیثیت ممتحن'' از محمد حنیف شاہد، وغیرہ۔

اقبال پر سوانحی ذخیرے میں بعض مباحث بھی اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً:

تاریخ ولادت کا مسئلہ قیام پاکستان کے بعد ربع صدی تک بھی متحقق نہ ہو سکا۔ زیادہ قرائن ۱۸۷۳ء کے حق میں تھے، مگر سرکاری سطح پر ۱۹۷۳ء تک تاریخ ولادت کا تعین ہی نہ ہو سکا۔ اس ضمن میں جب بھارت کو پہل کرتے دیکھ کر حکومت پاکستان نے ۱۸۷۷ء کو اقبال کا سال ولادت قرار دے دیا، اور اسی مناسبت سے حکومت پاکستان نے سال ۱۹۷۷ء کو ''اقبال صدی'' کے طور پر منانے کا اہتمام کیا۔ تاریخ ولادت کی بحث اس کے بعد بھی جاری رہی۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (مرتبین: ڈاکٹر وحید قریشی + زاہد منیر عامر، ۱۹۹۴ء) میں اس موضوع پر مطبوعہ منتخب مضامین یک جا کیے گئے ہیں، ان پر حواشی کا اضافہ بھی ہے، مگر صحیح تاریخ ولادت کیا ہے؟ اس کتاب کے مقدمے میں، مسئلہ حل کرنے کے بجائے زاہد منیر عامر نے اس کا ''فیصلہ معزز قاری اور مستقبل کے مؤرخ پر چھوڑ دیا'' ہے۔

بعض اصحاب نے اقبال کی شخصیت کا مطالعہ، جدید علم نفسیات کی روشنی میں کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد عثمان کا مضمون ''حیات اقبال کا ایک جذباتی دور'' (۱۹۵۷ء)[۳۶] خاصا متوازن تھا۔ بیس برس بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے علم نفسیات و تاویلات کے ذریعے اقبال کے قیام یورپ اور مابعد کے ۵، ۷ سالوں کا (بقول خود) ایک ''مزے دار'' منظر نامہ تیار کیا: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ (۱۹۷۷ء)۔[۳۷] انھوں نے تحلیلِ نفسی کی مدد سے اقبال کی شخصیت کے تاریک نہاں خانوں میں جھانکا اور ''غوطہ لگا کر آئس

برگ کی حقیقت کو جاننے کی جرأت'' کی۔ اس ''تفتیش'' کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ اقبال اور عطیہ بیگم کے درمیان ''تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟'' مگر وہ خود کہتے ہیں: ''اس ضمن میں صرف قیاسات سے ہی کام لیا جاسکتا ہے''۔ اس پر جناب نعیم صدیقی نے سوال اٹھایا کہ فاضل نقاد کیا اسی انداز میں اپنے والدین کا نفسیاتی تجزیہ کرنا بھی پسند کریں گے؟ پھر کیا تمام بزرگانِ ملت، اولیا اور اتقیا کا نفسیاتی تجزیہ مناسب رہے گا؟ ان کے خیال میں یہ محض ایک مریضانہ ذہنیت کی کارفرمائی ہے اور اس کے ڈانڈے ترقی پسندوں کی تحریکِ انہدام اقبال سے ملتے ہیں۔[۳۸] شرفا، اپنے مرحومین کا پوسٹ مارٹم پسند نہیں کرتے۔

بجا ہے کہ اقبال لاہور کے ''گھٹن کے ماحول'' سے نکل کر، یورپ کی آزاد اور رنگین فضا میں پہنچے تو وہ ایک عرصے تک اندرونی کش مکش میں مبتلا رہے، (اندرونم جنگ بے خیل و سپہ) مگر صدیقی صاحب کہتے ہیں:

> اقبال یورپ کی آزاد فضاؤں سے جس پاکیزگی کے ساتھ گزرا ہے، وہ بڑا قابل فخر جوہر سیرت ہے، بلکہ اگر آپ ثابت کر دیں کہ اس کے اندر کوئی جنسی داعیہ کام کر رہا تھا تو اس داعیے کے حملے سے جس خوبی سے بچ کر اقبال نکلا ہے، کوئی مہا تپسی بھی اس طرح نہ نکل سکے گا۔ یہی ضبط نفس اور ایثار ذات ہے، جس نے اس کی شخصیت اور اس کی فکر اور اس کے فن کو بے حد بالیدگی دی۔[۳۹]

یہی نتیجہ پروفیسر محمد عثمان نے اخذ کیا کہ اس سارے قصے کا ''انجام بصیرت افزا اور نظر افروز ثابت ہوا اور اس کی بدولت اردو شاعری کو فکر و جذبے کی وہ ندرت اور ثروت نصیب ہوئی جو اسے میر و غالب کے ہاتھوں کبھی میسر نہ آ سکتی تھی''۔[۴۰]

اس باب میں ایک غور طلب امر یہ ہے کہ اقبال کے نفسیاتی تجزیوں میں زیادہ تر عطیہ بیگم کے بیانات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ عطیہ کی کتاب میں، بلاشبہہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہے، مگر اس کے تمام بیانات کو جوں کا توں قبول کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے خیال میں عطیہ کے بعض بیانات میں تضاد ہے اور کتاب میں عطیہ کا ''جذبہ خودنمائی'' جھلکتا ہے۔ ''محلوں کی ناز پروردہ، تفریحات و تعیّشات کی دل دادہ'' اور ''سطحی خیالات اور تفریحی رجحانات'' رکھنے والی عطیہ اور اقبال جیسے درویش مزاج اور پرخلوص شخص کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، بلکہ صدیقی صاحب نے طویل تجزیے (عروج اقبال، ص ۳۲۱ تا ۳۲۸) کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عطیہ کے بعض ''بیانات، دراصل خود ان کے شکستِ پندار کی دلیل ہیں''۔ سعید اختر درانی نے بھی عطیہ بیگم کے بیانات کو ''مبالغہ آمیز'' قرار دیا ہے (اقبال، یورپ میں طبع دوم، ص ۲۶۴) سو، یہ قرین انصاف نہ ہوگا کہ اقبال کے نفسیاتی تجزیوں کی بنیاد، عطیہ بیگم کے بیانات پر استوار کی جائے۔[۴۱]

۵

اقبالیاتی ادب کا غالب حصہ، حضرت علامہ کے فکر و فلسفے کی تشریح و تعبیر اور تنقید و تجزیے پر مشتمل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستانی اقبالیات اردو کا تقریباً تین چوتھائی حصہ، تنقیدِ اقبال کے ذیل میں آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی زمانے میں اس نوعیت کی کتابوں میں سے محمد احمد خاں کی اقبال کا سیاسی کارنامہ (۱۹۵۲ء)، خلیفہ عبدالحکیم کی فکرِ اقبال (۱۹۵۷ء)، عابد علی عابد کی شعرِ اقبال (۱۹۶۴ء) اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی مقاماتِ اقبال (۱۹۵۹ء) نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔

فکرِ اقبال اپنی بعض خامیوں کے باوجود مقبول ہوئی، کیونکہ ایک تو مصنف کا نام اہم تھا، دوسرے: اس وقت ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی، جس میں اقبال کے تمام اہم نظریات کی یک جا اور ایسی جامع تشریح ملتی ہو، اس لیے طالب علموں کے حلقوں میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ تیسرے: ایک سرکاری ادارے (بزمِ اقبال) سے اس کی اشاعت کی وجہ سے اس کی استنادی حیثیت کو تقویت ملی۔ بلاشبہہ اس میں علامہ کے بیش تر افکار و تصورات پر دل کش اسلوب میں جامع تبصرہ ملتا ہے، مگر اس میں بعض خامیاں بھی ہیں۔ بڑی خامی تو مصنف کے ذہن میں ہے۔ فکرِ اقبال میں کئی مقامات پر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اسلام کی حقانیت کے بارے میں مصنف کا ذہن صاف نہ تھا۔ انھیں شبہ تھا کہ عصرِ حاضر میں اسلام ایک زندہ و توانا نظریہ اور ایک انقلابی قوت بن سکتا ہے۔ مرحوم خلیفہ صاحب مغرب سے مرعوبیت کا شکار تھے، اس لیے انھیں، عقل پر اقبال کی تنقید اچھی نہیں لگی۔ مزید برآں وہ اسلام اور اقبال سے اشتراکیت برآمد کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، تاہم فکرِ اقبال کا آخری باب (نمبر ۲۰، خلاصۂ افکار) جامع ہے اور اس میں توازن بھی ہے۔ خلیفہ صاحب کے ایک مداح پروفیسر محمد عثمان نے فکرِ اقبال کو ''مایوس کن'' قرار دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> خلیفہ مرحوم نے بہت سی مفید باتیں خاصے دل چسپ انداز میں بیان کی ہیں، مگر جہاں تک محققانہ دقتِ نظر، احتیاط پسندی اور حقائق کو جزئیات کے ساتھ تمام و کمال دیکھنے دکھانے کی کوشش کا تعلق ہے، فکرِ اقبال ہر جگہ اور ہر باب میں اپنے تشنہ اور ناکام ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔[۴۲]

راقم کا پختہ عقیدہ ہے کہ جو شخص صدقِ دل سے فکرِ اقبال کا شعور و ادراک نہ رکھتا ہو اور اس کا قلب و ذہن فکرِ اقبال کو اپنے عقیدہ و عمل کا حصہ بنانے کے لیے تیار نہ ہو، وہ اقبال کا روایتی اور پیشہ ور نقاد تو ہو سکتا ہے، صحیح معنوں میں ''اقبال شناس'' نہیں بن سکتا۔ جو بات فقط نوکِ قلم سے نکلے اور دل و دماغ سے اس کا علاقہ نہ ہو، اس میں تاثیر کہاں؟

عابد علی عابد (م: ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء) نے شعرِ اقبال میں شاعر کے ''شعورِ تخلیق کا جائزہ'' لیتے ہوئے فنی رموز و علائم، صنائع و بدائع اور محسناتِ شعر کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلا مبسوط اور

مربوط مطالعہ ہے، مگر مصنف کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ اس ذہین اور طرار خاتون [عطیہ فیضی] کی رفاقت نے اقبال کی تخلیقی کاوشوں کو متاثر کیا (ص ۲۳۲)۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عطیہ فیضی سطحی اور تفریحی ذہنیت رکھتی تھیں اور ان کے بعض بیانات خلافِ حقیقت ہیں۔ بعد ازاں کچھ دیگر ناقدین نے بھی ''شاعر اقبال'' کے کمالِ فن کو نمایاں کیا (جابر علی سید، افتخار احمد صدیقی، پروفیسر نذیر احمد، سعد اللہ کلیم، تبسم کاشمیری وغیرہ)۔[۴۳] اس کے باوجود شعر اقبال کے فنی تجزیے کا پہلو اور اقبال بحیثیتِ شاعر کا موضوع، فکر و فلسفے پر تنقید کے مقابلے میں دبا ہی رہا ہے۔ پاکستان میں اقبالیاتی ادب کا معتدبہ حصہ اقبال کی پیغمبرانہ، مجددانہ اور مفکرانہ حیثیت پر مشتمل ہے، حالانکہ ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی فکری اہمیت سے فروتر نہیں ہے۔ اقبال کی بلند پایہ شاعری ہی نے، ان کے فکر و فلسفے میں جاذبیت، تاثیر اور ندرت پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ (م: ۱۹۸۶ء) جیسا فاضل معلم اور زیرک نقاد مسلسل ۴۵ برس تک اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو منور کرتا رہا۔ اقبال پر ان کی تصانیف: مسائلِ اقبال (۱۹۷۴ء)، مقاصدِ اقبال (۱۹۸۱ء)، مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ (۱۹۸۴ء) اور درجنوں مضامین، اقبالیات پر ان کی عمیق اور عالمانہ نظر اور ان کے برسوں کے غور و خوض اور تدبر و تفکر کا ماحصل ہیں۔ انھوں نے فلسفۂ اقبال کے مشکل اور ادق نکات کو بھی سہل بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ فکرِ اقبال کو ایک علمی، فکری اور نظریاتی تحریک بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ محمد اکرام چغتائی نے اقبالیات پر سید صاحب کی تمام تحریروں کو اعجاز اقبال کے نام سے یکجا شائع کیا ہے۔ (سنگ میل لاہور، ۲۰۰۴ء)۔[۴۴]

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (م: ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء) چوٹی کے اقبال شناس اور اقبال اکادمی پاکستان کے بانی ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے اقبال ریویو کے ذریعے مطالعۂ فکرِ اقبال کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کی کتاب اقبال کا فلسفۂ خودی اس موضوع پر پہلا عالمانہ اور فلسفیانہ مربوط مطالعہ ہے۔ ممتاز حسن (م: ۲۸/ اکتوبر ۱۹۷۴ء) اور بشیر احمد ڈار، (م: ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء) اقبالیاتِ پاکستان کے معماروں میں سے تھے۔ اقبال اکادمی سے وہ (علی الترتیب) بطور نائب صدر اور ڈائریکٹر وابستہ رہے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا، لکھوایا، منصوبے تیار کیے اور اقبالیات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، خصوصاً ڈار صاحب نے اردو اور انگریزی میں قابل قدر تنقیدی اور تدوینی کام انجام دیے، مثلاً:

- *Iqbal and Post- Kantian Voluntarism* (۱۹۵۶ء)
- انوار اقبال (۱۹۶۷ء)،
- *A Study in Iqbal's Philosophy* (طبع دوم ۱۹۷۱ء)
- *Letters of Iqbal* (۱۹۷۷ء)
- *Articles on Iqbal* (۱۹۹۷ء)

اول الذکر پر انھیں ''قومی صدارتی اقبال اوارڈ'' دیا گیا۔ اقبال اور عبد الحق، ممتاز حسن مرحوم کا نمونے کا کام ہے۔ اقبالیات پر انھوں نے اعلیٰ درجے کے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں (مقالاتِ ممتاز)۔[۴۵] اسی طرح محمد عبداللہ قریشی (م: ۱۲/اگست ۱۹۹۴ء) نے زیادہ تر تو ترتیب و تدوین کے شعبے میں بعض مفید اور قابل قدر کام کیے۔ (مکاتیب اقبال بنام گرامی ۱۹۶۹ء۔ اقبال بنام شاد ۱۹۸۵ء۔ حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں ۱۹۸۶ء۔ حیات جاوداں ۱۹۸۷ء۔ تذکار اقبال ۱۹۸۸ء)۔ تاہم ان کی بعض معلومات افزا کاوشیں (معاصرین، اقبال کی نظر میں، ۱۹۷۷ء۔ حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں، ۱۹۸۶ء۔) تحقیق و تنقیدِ اقبالیات میں شمار ہوں گی۔ ڈاکٹر محمد ریاض (م: ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء) نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کا شعبۂ اقبالیات منظّم کیا اور اقبالیات پر مضامینِ نو کے انبار لگا دیے۔ ان کے ہاں پھیلاو زیادہ ہے اور عمق نسبتاً کم۔ تقریباً ایک درجن تنقیدی مجموعوں کے علاوہ انھوں نے این میری شمل کی Gabriel's Wing کا اردو اور اقبال کی ڈائری Stray Reflections کا فارسی ترجمہ کیا۔ فارسی میں ایک کتابیات کتاب شناسی اقبال کے نام سے مرتب کی۔[۴۶] ان کی مجموعی اقبالیاتی خدمات قابل قدر ہیں۔

محمد رفیق خاور (م: ۱۵ مئی ۱۹۹۰ء) نے بھی اقبالیاتی ادب میں وقیع اضافہ کیا۔ اقبال کی شاعری کے اردو، انگریزی اور فارسی تراجم کے علاوہ، انھوں نے اقبالیاتی تنقید بھی لکھی اور اقبال کا فارسی کلام (۱۹۸۸ء) پر ''قومی صدارتی اقبال اوارڈ'' حاصل کیا۔

پروفیسر محمد منور (م: ۷ فروری ۲۰۰۰ء) اقبالیات کے ان تھک مفسر، شارح اور نقاد تھے۔ انھوں نے شعبۂ اقبالیات پنجاب یونی ورسٹی کے صدر، اقبال اکادمی کے ناظم اور سالہا سال تک مرکزیہ مجلس اقبال کے کلیدی مقرر کی حیثیت سے فروغ اقبالیات کے لیے قابل تحسین خدمات انجام دی ہیں۔ بارہا بیرون ملک اقبالیاتی دورے بھی کیے۔ ان کی تصانیف نے قارئین میں فکرِ اقبال کا ایک پختہ، سچا اور کھرا فہم و شعور پیدا کیا۔ تصانیف: میزانِ اقبال (۱۹۷۲ء)، ایقانِ اقبال (۱۹۷۷ء)، اقبال کی فارسی غزل (۱۹۷۷ء) Iqbal and Quranic Wisdom (۱۹۸۱ء)، برہانِ اقبال (۱۹۸۲ء)، Dimensions of Iqbal (۱۹۸۶ء)، Iqbal: The Poet -Philosopher of Islam ۱۹۸۲ء، قرطاسِ اقبال، ۱۹۸۸ء۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: ''پروفیسر صاحب کو اللہ پاک نے ''آہِ سحر'' اور ''نورِ بصیرت'' دونوں سے نوازا ہے، اس لیے وہ صحیح مسلمان فاضل کی طرح اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں''۔ (دیباچہ: برہانِ اقبال)۔ راقم الحروف کے خیال میں وہ ''بابائے اقبالیات'' کہلانے کے مستحق ہیں۔[۴۷]

اقبالیاتی خدمات ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی (پ: ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء) کا نام بھی اہم ہے۔ وہ ایک عرصے تک بزم اقبال لاہور اور اقبال اکادمی کے ناظم اور ان اداروں کے تحقیقی مجلّات کے مدیر رہے۔ ان کی

تحریک وتشویق پر بہت سی مفید کتابیں مرتب وشائع ہوئیں۔ان کے تنقیدی مضامین اساسیاتِ اقبال (۱۹۹۶ء) پر انھیں ''قومی صدارتی اقبال اوارڈ'' دیا گیا ہے۔''اقبال اور اسلامیہ کالج'' اور ''اقبال اور اورینٹل کالج'' جیسے اور اسی طرح کے دیگر وقیع تحقیقی مقالات پر مشتمل، ان کا موعودہ مجموعہ ہنوز تشنۂ ترتیب وطباعت ہے۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (م: ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء) نے بطور استاد وصدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد؛ ایم فل کے بیسیوں تحقیقی مقالات کی نگرانی وراہ نمائی کی۔متعدد کتابیں: اوراقِ گم گشتہ (۱۹۷۵ء)، *Mementos of Iqbal* (۱۹۷۵ء)، اقبال کے معاشی نظریات (۱۹۷۶ء)، ارمغانِ اقبال (۱۹۹۱ء) پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ بعنوان: مکاتیبِ اقبال کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۷ء) اور بیسیوں غیر مدون تحقیقی وتنقیدی مقالات ان سے یادگار ہیں۔[۴۸]

ڈاکٹر صدیق جاوید (پ: ۱۰/اپریل ۱۹۳۶ء) نے سوانحی اور تنقیدی پہلوؤں پر مفید کام کیا ہے۔بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۸۷ء)، اقبال پر تحقیقی مقالے (۱۹۸۸ء) اور اقبال کا عمرانی مطالعہ (۱۹۸۹ء)۔ان کی اقبالیاتی تحریروں کا کلیات بعنوان: اقبال، نئی تفہیم شائع ہو چکا ہے۔(سنگ میل لاہور، ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر تحسین فراقی (پ: ۱۷/ستمبر ۱۹۵۰ء) کی بعض کاوشوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔جہاتِ اقبال (۱۹۹۳ء) کے بعد، انھوں نے نئے مجموعۂ مضامین اقبال: چند نئے مباحث (۱۹۹۸ء) پر اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے تحقیق وتنقید کا ''وزیر اعظم ادبی انعام'' حاصل کیا ہے۔اس پر انھیں ''قومی صدارتی اقبال اوارڈ'' بھی دیا گیا ہے۔ڈاکٹر ایوب صابر (پ: ۱۹۴۲ء) نے علامہ اقبال کی شخصیت اور فکروفن پر اعتراضات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تحریر کیا تھا۔اقبال پر اعتراضات اور مخالفانہ تنقید کا مطالعہ وتجزیہ اور دفاعِ اقبال، ان کا تخصص ہے۔ان کا ایم فل کا مقالہ: اقبال دشمنی: ایک مطالعہ کے نام سے، اور ڈاکٹریٹ کے مقالے کے بعض اجزا، متعدد کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔(اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ، ۲۰۰۳ء، اقبال کا اردو کلام، ۲۰۰۳ء، تصور پاکستان: علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ، ۲۰۰۴ء، معترضین اقبال، ۲۰۰۴ء)۔

ڈاکٹر صابر کلوروی (پ: ۳۱/اگست ۱۹۵۰ء) کو باقیاتِ کلامِ اقبال کے موضوع پر تخصص حاصل ہے۔کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال، (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء) انھوں نے ملفوظاتی مضامین اقبال کے ہم نشین (لاہور، ۱۹۸۵ء) کی تدوین کی۔اور اشاریہ مکاتیب اقبال (لاہور، ۱۹۸۴ء) مرتب کیا۔یادِ اقبال (شاہکار لاہور، ۱۹۷۶ء، جریدی تقطیع) کے نام سے اقبال کی سوانح عمری لکھی، جو نظر ثانی کے بعد، داستانِ اقبال کے عنوان سے شائع ہوئی۔اقبال کے غیر مدوّن مکاتیب کی تدوین، ان کا ربع صدی پرانا

منصوبہ ہے، مگر ان کا زیادہ تر وقت اقبالیاتی موضوعات پر ایم فل کا تحقیقی کام کرانے اور نوجوان محققین کی تربیت میں صرف ہوتا ہے۔

اقبال کے نقاد اور تجزیہ نگار بعض مخصوص موضوعات کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں، جیسے: تصوفِ اقبال (شاہ عبدالغنی نیازی، ابوسعید نور الدین، پروفیسر محمد فرمان، محمد شریف بقا، ابواللیث صدیقی، بشیر مخفی القادری، الف دنسیم) یا اقبال کے تعلیمی نظریات (محمد احمد خاں، محمد احمد صدیقی، بختیار حسین صدیقی، محمد فاروق جوبش)۔ بعض اصحاب نے اقبال کو اشترا کی عینک سے دیکھا (ممتاز حسین، محمد حنیف رامے، صفدر میر، ثاقب رزمی، ریاض صدیقی وغیرہ)۔

مختلف موضوعات پر مقالات و مضامین کے بیسیوں مجموعے چھپے۔ یہاں سب کے نام گنوانا ممکن نہیں، تاہم ہماری معلومات کی حد تک اقبال پر تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے پیش کرنے والوں کے نام یہ ہیں: مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر حمید احمد خاں، سید عبداللہ، سید وقار عظیم، میرزا ادیب، نعیم صدیقی، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر محمد ریاض، رحیم بخش شاہین، پروفیسر فروغ احمد، پروفیسر محمد منور، ڈاکٹر وحید قریشی، غلام حسین ذوالفقار، خواجہ محمد زکریا، سید محمد اکرم، انور سدید، پروفیسر فتح محمد ملک، جیلانی کامران، سلیم اختر، جابر علی سید، سید افتخار حسین شاہ، تبسم کاشمیری، پروفیسر محمد عثمان، عبدالواحد معینی، ظہور احمد اعوان، تحسین فراقی، گوہر ملسیانی، سمیع اللہ قریشی، خواجہ حمید یزدانی، انعام الحق کوثر، اے بی اشرف، ملک حسن اختر، چودھری مظفر حسین، اسلم انصاری، احسان اکبر، احمد ہمدانی، رفیع الدین ہاشمی وغیرہ۔

علامہ اقبال پر بعض اکابر (سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، چودھری محمد حسین، غلام رسول مہر، محمد دین تاثیر، صوفی تبسم، فیض احمد فیض، عزیز احمد، آل احمد سرور، عابد علی عابد) کی تحریروں کو مختلف مرتبین نے یک جا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کیا۔ غالب، رومی، حافظ، اکبر، مودودی اور مشرق و مغرب کی بعض دیگر شخصیات سے اقبال کے تقابلی مطالعے پر مبنی متعدد مضامین اور کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

بعض اصحاب نے مربوط کتابی مطالعے پیش کیے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی صدارتی اقبال اور اڈیافتہ اقبال اور قرآن، ڈاکٹر وزیر آغا کی تصوراتِ عشق و خرد، اقبال کی نظر میں، پروفیسر آسی ضیائی کی کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ، ڈاکٹر خالد مسعود کی اقبال کا تصورِ اجتہاد (اردو اور انگریزی)، خواجہ منظور حسین کی اقبال اور بعض دوسرے شعرا، ڈاکٹر محمد ریاض کی اقبال اور فارسی شعرا، ڈاکٹر عبدالشکور احسن کی اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسعد گیلانی کی اقبال، دارالاسلام اور مودودی، جعفر بلوچ کی اقبال اور ظفر علی خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اقبال سب کے لیے جیسی کتابوں میں اقبال کے حالات اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا جامع احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حمید نسیم (م: ۲۸ ستمبر ۱۹۹۸ء) اقبال کو حکیم اور فلسفی کہنے پر معترض ہیں۔ ان کے خیال میں وہ ''حکیم الامت'' نہیں بلکہ ایک شاعر ہیں، ملی شاعر جنھوں نے قوم کو ایک خاص پیغام دیا۔ حمید نسیم کا یہ خیال محل نظر ہے کہ اقبال کے مردِ کامل کا تعقل بیش تر مغربی مفکروں کے افکار سے مستعار ہے۔ وہ اقبال کے خطبات کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے، البتہ اقبال کو عالمی سطح کے عظیم شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی کتاب (علامہ اقبال، ہمارے عظیم شاعر، ۱۹۹۳ء، قومی صدارتی اقبال اوارڈ یافتہ ہے۔

علامہ اقبال پر مولوی احمد دین (م: ۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء) نے سب سے پہلی اردو کتاب (اقبال، ۱۹۲۳ء) شائع کی تھی۔ علامہ نے اسے پسند نہیں کیا، کیونکہ اس سے کلامِ اقبال کی اشاعت متاثر ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے مصنف نے اس کتاب کے سارے نسخے جلا کر ضائع کر دیے۔ پھر ۱۹۲۶ء میں اسے از سر نو لکھا۔ جناب مشفق خواجہ (م: ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء) نے اسے ایک مفصل مقدمے اور حواشی کے ساتھ مدوّن کر کے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ (چند تبدیلیوں کے ساتھ تازہ اڈیشن: اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۶ء) کسی اقبالیاتی کتاب کی تحقیقی تدوین کے ضمن میں اسے ایک مثال بنایا جا سکتا ہے۔[۴۹]

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے اقبالیاتی ادب کا سب سے بڑا ذخیرہ تنقیدِ اقبال سے متعلق ہے، جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

تنقیدِ اقبال کے اس بحرِ زخار میں طرح طرح کے رجحانات و رویے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تحسین و توصیف کا رویہ غالب ہے اور سب سے زیادہ اقبال کی پیغمبرانہ حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اقبال کی فکری اساس قرآن حکیم پر استوار ہے چنانچہ اقبالی مصنفین کی عظیم اکثریت زندگی کو مذہب اور اخلاقی قدروں کے حوالے سے دیکھنے کی عادی ہے۔ برعظیم کی تاریخ و سیاست کے حوالے سے، اقبال کی سوچ، فکر اور ان کا طرزِ عمل ہمیں قومی اور ملی امنگوں کے مطابق نظر آتا ہے۔ دوسرا رویہ اقبال سے اختلاف کا ہے، جس کے تحت مختلف نقادوں نے اپنے اپنے معتقدات کی روشنی میں اقبال کا تجزیہ کیا ہے۔ خودی اور تصوف کے مسئلے پر اختلاف یا اقبال کے سیاسی افکار و تصورات میں تضادات یا اقبال کا نظریۂ قوت و پیکار (بحوالہ شاہین) یا اقبال کے سماجی و معاشی تصورات پر اشتراکیوں کا اختلاف وغیرہ — اس طرح کے اختلافات کہیں اقبال شکنی کا رجحان بن جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال کی شخصیت کو منہدم یا اسے مجروح کرنے کی شعوری کوشش ہو رہی ہے۔ (عالم خوند میری نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ اقبال کے ہاں تضادات اس وقت نظر آتے ہیں جب ہم فکرِ اقبال کے کسی ایک جز کو دوسرے جز سے الگ کر دیتے ہیں۔ کُل اقبال کو پیشِ نظر رکھیں تو الجھن ختم ہو جاتی ہے)

بھارت کے بعض نقاد کہتے ہیں کہ اہل پاکستان علامہ اقبال پر تنقید کے روادار نہیں اور انھوں نے

اقبال کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا ہے ـــــ عرض ہے کہ اگر وہ خدوخالِ اقبال، ۱۹۸۶ء از محمد امین زبیری یا صدائے احتجاج، ۱۹۹۰ء از شمیم رجز، جیسی کتابیں دیکھ لیتے یا سردار محمد عبدالقیوم خاں کی (ناروے کی) تقریر پڑھ لیتے یا اقبال کے بارے میں جی ایم سید، غلام مصطفیٰ شاہ اور ابراہیم جویو کے ''ارشادات'' سے آگاہ ہوتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ پاکستان میں اقبال ''مقدس گائے'' نہیں ہے بلکہ ان پر دل کھول کر مخالفانہ بلکہ متعصّبانہ اور معاندانہ تنقید کی گئی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ محمد ایوب صابر کی کتاب اقبال دشمنی: ایک مطالعہ (۱۹۹۳ء) سے بھی ہوتا ہے۔ افسوس ہے اقبال دشمن عناصر نے اختلاف اور دشمنی کا فرق ملحوظ نہیں رکھا۔

اقبال کے بیش تر نقادوں کا رویہ متوازن و معقول ہے۔ انھوں نے بعض امور میں اقبال سے اختلاف کیا مگر ان کی قرار واقعی ستایش و تحسین میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کا رویہ ناقدانہ ضرور ہے، مگر مخالفانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔

علی عباس جلال پوری کی اقبال کا علم الکلام ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اقبال فلسفی نہیں متکلم تھے۔ فلسفی آزادانہ غور وفکر کرتا ہے مگر اقبال نے پہلے سے چند مفروضے قائم کر کے، انھیں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ کہ اقبال خرد دشمن اور تمدن دشمن تھے یا ان کا ''نظریۂ خودی بتمام وکمال فشٹے سے ماخوذ ہے'' وغیرہ۔ فنون کے صفحات پر ایک عرصے تک بشیر احمد ڈار سے ان کی قلمی معرکہ آرائی جاری رہی۔[۵۰]

ایک اور قلمی مباحثہ سلیم احمد کی کتاب اقبال: ایک شاعر نے پیدا کیا۔ ان کے خیال میں موت، اقبال کا مرکزی مسئلہ ہے اور وہ اپنی شاعری کے ہر جز کے ذریعے موت سے جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ''اقبال کا تصورِ قوت' امام بخش گاماں پہلوان کی کشتی کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا'' یا ''ممکن ہے ساقی نامہ والا تصورِ حرکت' سیالکوٹ کی کسی ندی پر نہانے کا ردِ عمل ہو' وغیرہ۔ پروفیسر محمد عثمان، فتح محمد ملک اور صدیق جاوید نے نوائے وقت کے صفحات پر ردِ عمل ظاہر کیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کا دفاع کرتے ہوئے اسے ''بڑی شاعری پر بڑی تنقید'' قرار دیا۔[۵۱] بایں ہمہ سلیم احمد کے ان سوالات کا تشفی بخش جواب سامنے نہیں آسکا کہ ہمارے شعرا کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات کیوں نہیں قبول کیے؟ اور ہمارے اہم ترین نقادوں (عسکری، مجنوں، فراق وغیرہ) نے اقبال سے خاطر خواہ اعتنا کیوں نہیں کیا؟ سلیم احمد نے کتاب کے دوسرے اڈیشن میں مزید توضیحات پیش کیں اور کتاب پر بعض اعتراضات کے جواب بھی دیے۔ یہ مباحثہ ومکالمہ ان کی وفات (یکم ستمبر ۱۹۸۳ء) کے بعد بھی جاری رہا۔ نظیر صدیقی، اپنے ایک مضمون قومی زبان، کراچی، ستمبر ۱۹۸۹ء، ص ۴۴) میں لکھتے ہیں: ''انھوں نے اپنی قوم کو، بلکہ نوعِ انسان کو موت سے

آنکھیں چار کرنے کے قابل بنا دیا، اور اس لحاظ سے ان کی شاعری موت کے خوف کی شاعری نہیں، بلکہ موت کے خوف پر غالب آنے کی شاعری بن جاتی ہے''۔

۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (م: ۴؍اپریل ۱۹۹۵ء) نے ایک سلسلۂ مضامین کا آغاز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ علامہ اقبال، اس دور کے مجدد بلکہ ''مجتہدِ مطلق'' ہیں۔ موصوف کا دعویٰ تھا کہ اقبال، اجتہاد اور تعبیرِ شریعت کا اختیار علما اور فقہا سے لے کر قانون ساز اسمبلیوں کو منتقل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اسمبلیاں ''گہری بصیرت کے حامل عوام کی منتخب'' ہوتی ہیں جب کہ فقہا ملوکیت کے نمایندے اور نامزد ہوتے ہیں۔ انھوں نے بار بار اس امر پر زور دیا کہ علامہ اقبال نے اسلامی ریاست (پاکستان) کی قانون ساز اسمبلی کو ''اجتہادِ مطلق'' کا اختیار دیا ہے۔ گورایہ صاحب کے نزدیک پاکستانی پارلیمنٹ کا وجود افکارِ اقبال کا مرہونِ منت ہے، اس لیے اس پارلیمنٹ کا اخلاقی، قومی اور تاریخی فرض ہے کہ وہ شریعت کی نئی تعبیر انجام دے کیونکہ اسی صورت میں پاکستان ایک مثالی اور جدید اسلامی ریاست بن سکتا ہے۔ اس بحث میں بہت سے اہلِ قلم نے حصہ لیا اور یہ مباحثہ ڈیڑھ دو برس تک چلتا رہا مگر اس ساری بحث میں اس سوال کا تشفی بخش جواب سامنے نہیں آیا کہ اجتہاد اور تعبیرِ شریعت کا اختیار جس پارلیمنٹ کو دیا جائے گا، اس کے ارکان کا معیار کیا ہوگا؟ مروجہ جمہوریت میں تو ہرا ایرا غیرا، بددیانت، خائن، بدعنوان، اور فاسق و فاجر اندھا دھند اور بے تحاشا روپیا خرچ کر کے یا دھاندلی اور غنڈہ گردی کر کے رکن بن سکتا ہے۔ کیا فی الواقع علامہ اقبال ایسے ہی ''مجتہدین'' کو تعبیرِ شریعت کا اختیار سونپنا چاہتے تھے؟[۵۲]

اس زمانے (۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء) میں اخبارات میں ''ناروے کی ناروا بحث'' بھی چلتی رہی۔ دسمبر ۱۹۸۷ء میں اوسلو میں منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر جاوید اقبال اور سردار محمد عبدالقیوم خاں شریک تھے۔ تقریب میں جاوید صاحب کی تقریر سن کر سردار صاحب بے مزہ ہوئے۔ ان کے الفاظ تھے: ''مجھے سخت صدمہ ہوا''۔ ردِعمل میں وہ بہت سی تلخ باتیں کہہ گئے۔ یہ ردِعمل، علامہ اقبال سے زیادہ پسرِ اقبال کے خلاف تھا مگر غم و غصے کے عالم میں، عدمِ توازن کا شکار ہو کر، وہ جاوید اقبال کے والد کو بھی بُرا بھلا کہنے لگے۔ یہ نہ سوچا کہ علامہ اقبال، محض جاوید اقبال کے والد نہیں، ملتِ اسلامیہ کا عظیم اور قابلِ فخر سرمایہ بھی ہیں اور ایک شاعر کے علاوہ احیاے دین و ملت کی ایک اہم علامت بھی۔ سردار صاحب کا لہجہ فی الواقع غیر محتاط تھا اور وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے، بقول پروفیسر محمد منور:

تھا ناروے میں ناروا، اسلوب آپ کا

انھیں اندازہ نہیں کہ انھوں نے اقبال کے مداحوں کے دل دکھائے۔ ڈاکٹر غلام علی چودھری نے

اقبال کے دفاع میں من ابے میرا مم! داد از تو خواہم کے نام سے پوری کتاب لکھ ڈالی۔ اس بحث میں بعض اصحاب (ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا صدرالدین الرفاعی، مفتی محمد حسین نعیمی وغیرہ) نے ڈاکٹر جاوید اقبال پر بھی تنقید کی۔[۵۳]

ابتدائی زمانے میں انگریزی خطبات کی طرف قارئینِ اقبال کا اعتنا نہ ہو سکا (شاید اس لیے کہ ان کی زبان انگریزی تھی، وہ بھی اَدق۔ پہلا اردو ترجمہ ۱۹۵۸ء میں چھپا)۔ اب گذشتہ پندرہ، بیس برسوں کے دوران میں، خطباتِ اقبال کے مطالعے کی طرف خاصی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ خطبات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے متعدد کتابیں شائع ہوئیں، مضامین چھپے اور مذاکرے ہوئے۔ محمد شریف بقا کی خطباتِ اقبال پر ایک نظر [۱۹۷۴ء] اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ: متعلقاتِ خطباتِ اقبال (۱۹۷۷ء)، تفہیم خطبات کی اولین سنجیدہ کوشش تھیں۔ اس کے بعد خطبات کی تسہیل و تشریح کے ضمن میں متعدد کتابیں سامنے آئیں، مثلاً: پروفیسر محمد عثمان کی فکر اسلامی کی تشکیل نو (۱۹۸۵ء) یا بعض متفرق مضامین وغیرہ۔ بعدازاں بعض اصحاب نے (جن میں محمد یوسف گورایہ پیش پیش تھے) خطبات کو فکرِ اقبال کا ''بنیادی ماخذ'' قرار دیتے ہوئے زور دیا کہ اجتہاد کی عمارت علامہ کی اسی ''نمایندہ کتاب'' پر استوار کی جائے کیوں کہ اقبال کی شاعری، خطبات کے مقابلے میں ''ثانوی حیثیت'' رکھتی ہے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں علامہ کا تصور اجتہاد، خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقا پسند اور ارتقا پذیر رہا، لہٰذا یہ فرض کرنا درست نہ ہوگا کہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں انھوں نے جو کچھ کہا اور ان کی سوچ کا جو رخ، وفات سے ۸، ۹ برس پہلے ان کے خطبات میں نظر آتا ہے، وہ ۱۹۳۸ء تک جوں کا توں برقرار رہا۔ منور صاحب نے یہ بات، اس مقالے میں کہی تھی جو پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی کے زیر اہتمام خطبات اقبال پر ایک مذاکرے (۲ تا ۴/اپریل ۱۹۸۷ء) میں پیش کیا تھا۔ اس کی روداد اور مقالات پر مجموعۂ مضامین اقبال: فکر اسلامی کی تشکیل نو (مرتبہ: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، ۱۹۸۸ء) اس موضوع پر ایک لائق مطالعہ کتاب ہے۔ محمد سہیل عمر نے خطبات کو ایم فل اقبالیات کے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔ اس مقالے پر انھیں نہ صرف ڈگری ملی بلکہ اوپن یونی ورسٹی نے ''اقبال اوارڈ'' بھی عطا کیا۔ انھوں نے خطبات میں موجود بعض ''سوالوں'' کا ذکر کیا ہے۔ (مطبوعہ بعنوان: خطباتِ اقبال، نئے تناظر میں، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۶ء)۔ اقبال اکادمی نے خطبات پر مباحث کے لیے مجلّہ اقبالیات کا پورا شمارہ (جنوری ۱۹۹۷ء) مختص کیا۔ بعض اصحاب، خصوصاً ڈاکٹر وحید عشرت کی تحریروں پر چودھری مظفر حسین (م: ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء) نے گرفت کی اور انھیں ''اقبال شناسی کا انحطاط'' قرار دیا۔[۵۴]

قریبی زمانے میں خالد جامعی نے رسالہ ساحل اور جریدہ، کراچی کے ذریعے خطباتِ اقبال کے متعلق سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی سے منسوب یہ انکشاف فرمایا کہ خطبات کے بعض مباحث

میں اقبال کفروالحاد اور زندقہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور ان خطبات میں لادینیت مستور ہے۔ تاریخِ اقبالیات کے اس سب سے بڑے انکشاف کی بنیاد وہ مبیّنہ امالی ہیں جو سید سلیمان ندوی کی وفات (۱۹۵۳ء) کے ۳۶، ۳۷ برس بعد ۱۹۹۲ء کے آس پاس، سید صاحب کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر غلام محمد نے وقتاً فوقتاً خالد جامعی کو مبینہ طور پر املا کرائے۔

ان ''امالی'' کا دورانیہ تین برس میں پھیلا ہوا ہے۔ پھر ۱۵، ۱۶ برس تک یہ ''امالی'' خالد جامعی کی ''لوحِ محفوظ'' میں مستور رہے۔ ۲۰۰۶ء میں اچانک انھیں خیال آیا کہ خطباتِ اقبال کے ذریعے جو گمراہیاں پھیلتی جارہی ہیں، ان کے سدباب کے لیے ''امالی'' کی قرولی برآمد کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ خالد جامعی کے مطابق خطبات میں بے شمار تضادات ہیں کیوں کہ اقبال کے اجتہادات مغربی فکر و فلسفے کی پیداوار ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اقبال نے خطبات سے رجوع کرلیا تھا، مگر اس دعوے کا ثبوت؟ فقط قیاس کی بیساکھیوں کے ساتھ تو بڑے سے بڑا دعویٰ بھی ایک خوش خیالی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا ــــ بہرحال خطبات میں کفروالحاد اور زندقہ کا یہ انکشاف بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔

خالد جامعی کے مبیّنہ امالی پر بہت سے سوالات اٹھائے گئے مثلاً یہ کہ اگر سید سلیمان ندوی خطبات کو واقعی کفر و الحاد و زندقہ ہی سمجھتے تھے تو انھوں نے علامہ اقبال سے طویل سلسلہ خط کتابت اور بارہا ملاقاتوں اور کئی دن کے سفر افغانستان میں شب و روز کی صحبتوں میں کیوں نہ دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت کی؟ مبیّنہ طور پر وہ جن ''خدشات، وسوسوں اور اندیشوں'' میں مبتلا تھے، کبھی تو اقبال کے سامنے ان کا اظہار کیا ہوتا ــــ خالد جامعی کہتے ہیں: سید صاحب سمجھتے ہیں کہ اس طرح اقبال کا مرتبہ و مقام اور ان کی حیثیت مجروح ہوگی اور سید صاحب اقبال کی شاعری اور شخصیت کے مثبت اثرات کو زائل نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے کچھ نہ لکھا ــــ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر انھوں نے ڈاکٹر غلام محمد کے سامنے یہ خیالات کیوں ظاہر کیے؟ ــــ اس سوال کا جواب بھی نہ ملا۔ مزید سوال یہ کہ سید صاحب تو اقبال کو مجروح کرنے سے گریزاں رہے مگر غلام محمد صاحب (اللہ ان کی مغفرت کرے) نے ''امالی'' کا یہ ورثہ خالد جامعی کو کیوں منتقل کیا؟ اور اگر خالد جامعی اقبال کے ''مقام و مرتبے اور حیثیت'' اور ان کی شخصیت اور شاعری کے ''مثبت اثرات'' کے قائل ہیں تو پھر (جو کام سید صاحب نے نہیں کیا، دریابادی صاحب نے نہیں کیا۔) اس ''فرضِ کفایہ'' کی ادائیگی میں اس مستعدی کے ساتھ وہ (خالد جامعی) کیوں پرجوش ہوگئے؟ خالد جامعی صاحب نے ''امالی'' کی بہت تاویلیں کیں، راقم کے متعدد سوالات کے جواب دینے سے گریزاں رہے اور خلطِ مبحث کے لیے نئے نئے سوالات اٹھانے میں مستعد اور سرگرم رہے۔

براہ راست اقبال کی شخصیت اور اُن کی صلاحیتوں کو بقول سید قاسم محمود ''جارحانہ ذاتیات'' کی حد تک تنقید کا نشانہ بنایا۔ مثلاً یہ کہا کہ اقبال عربی نہیں جانتے تھے ان کا فہم قرآن و حدیث نہایت ناقص تھا، اقبال شاتم رسول کی سزا سے مکمل طور پر لاعلم تھے، وہ جرمن زبان سے ناواقف تھے، وہ شریعت اور فقہ کی معمولی باتیں بھی نہیں جانتے تھے، اسلامی علوم اور اسلامی فکر و فلسفے پر ان کی نظر نہایت سرسری تھی۔

اقبال کے بارے میں خالد جامعی کے سوالات خاصے توہین آمیز اور اشتعال انگیز ہیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہر قیمت اقبال کو ضعیف کرنا اور اُن کی سبکی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اقبال کا ذکر اس پیرایے میں کیا کہ لوگوں کے دل میں اقبال کی وقعت کم ہو جائے اور کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا کہ اُن کے دل میں اقبال کے خلاف بغض بھرا ہوا ہے۔ خالد جامعی قارئین کی جوابی تحریروں کو چھاپنے سے گریزاں رہے اور جو کچھ شائع کیا اُسے کانٹ چھانٹ کر کے اس انداز میں پیش کیا کہ ان کے اپنے موقف کی تائید کا تاثر پیدا ہو، یا ایسی ضمنی اور بعض اوقات سنسنی خیز سرخیاں لگا دیں جن سے مصنف کا موقف ہی غتر بود ہو گیا۔

راقم کے خیال میں یہ جامعی صاحب کی سراسر فتنہ انگیزی تھی جو اقبال کے ساتھ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر غلام محمد اور پورے دینی طبقے کے لیے رسوائی کا باعث ہوئی — سوال یہ ہے کہ خالد جامعی نے اس جگ ہنسائی کا اہتمام کیوں کیا؟ پس پردہ محرکات کیا تھے؟ اور وہ ہر اس شخص کی پگڑی اچھالنے میں کیوں لذت محسوس کرتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے خدمتِ دین میں لگا ہوا ہے۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہو سکا۔ شاید یہ راز، راز ہی رہے گا۔[۵۵]

مظفر حسین مرحوم نے قریبی زمانے میں پاکستان اور اسلام کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی وضاحت کے لیے چند کتابچے لکھے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک شاعر (علامہ اقبال) نے ہندی مسلمانوں کے لیے اسلام کے عصری تقاضوں کے مطابق ایک نصب العین متعین کر کے انھیں بحیثیت قوم ایک نیا جنم دیا، اور ایک سیاست دان اور مدبر (قائداعظم) نے سخت مشکلات کے باوجود، ایک شاعر کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دکھایا لیکن ان کے بعد جو سیاست دان آئے، انھوں نے اپنی پچاس سالہ غفلتوں، کوتاہیوں، بدعنوانیوں اور بداعمالیوں سے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔[۵۶] مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ مظفر حسین صاحب نفاذ اسلام میں ناکامی کی ذمہ داری دینی رہنماؤں اور ان کی جماعتوں، خصوصاً مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر عائد کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں مولانا مودودی نے علامہ اقبال کے ''کلچرل طریق کار'' کے بجائے ''آئیڈیالوجیکل طریق کار'' کو اپنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ علما کا اصل میدان تعلیم اور کردار سازی ہے اور انھیں اپنی ساری توجہ اس کام پر مرکوز رکھنی چاہیے اور عملی سیاست میں

حصہ لے کر اپنی توانائیوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔[۵۷] اقبالیات کے بیش تر طلبہ کے لیے، مظفر حسین کے یوٹوپین نقطۂ نظر سے اتفاق مشکل ہوگا، تاہم انھوں نے پاکستان کی عملی صورتِ حال میں اقبال کے افکار و نظریات سے راہ نمائی کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود ملک و ملت کے لیے ان کا جذبۂ دردمندی و دل سوزی قابلِ قدر ہے۔

۶

ایک تعجب خیز بات یہ کہ پاکستان کے نظریاتی بانی علامہ اقبال پر پاکستانی جامعات میں پی ایچ ڈی کی سطح پر بہت کم کام ہوا ہے۔ (تحقیق کار: ابوسعید نورالدین، محمد معروف، نذیر قیصر، رفیع الدین ہاشمی، صدیق جاوید، صابر کلوروی، نعیم احمد، رحیم بخش شاہین، فرزانہ ماجد، ندیم شفیق ملک، ناہید سلطانہ، محمد آفتاب احمد، محمد اشرف چودھری، اختر النسا، محمد ایوب صابر، گیوساب شین، محمد آصف اعوان، عبدالغنی، سجاد حسین شاہ، محمد وسیم انجم)۔ ۶۰ برسوں میں کل ۲۱ (ممکن ہے دو چار اور بھی ہوں) مقالات، البتہ ایم اے اور ایم فل کی سطح پر خاصی بڑی تعداد میں مقالات تحریر ہوئے۔ رفعت حسن، سید محمد اکرم اور خورشید انور نے اقبالیات پر پی ایچ ڈی کی اسناد بیرونِ ملک جامعات سے حاصل کیں۔ پنجاب یونی ورسٹی میں اقبالیات پر ایم اے کے تقریباً دو سو مقالے لکھے گئے۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات میں رفتارِ تحقیق نسبتاً تیز ہے۔ وہاں ایم فل کے تقریباً ۲۵۵ مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جہاں تک جامعاتی تحقیق کے معیار کا تعلق ہے، قدرِ اول کی چیزیں کم ہیں۔ ابھی تک ڈاکٹریٹ کے تقریباً نو، ایم فل کا ایک اور ایم اے کے تقریباً بارہ مقالوں کو اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ جامعات میں اقبال پر تحقیق، کسی بڑی اسکالرشپ کی منتظر ہے۔

جامعاتی تحقیق میں سب سے بڑا حصہ، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ بلاشبہہ تحقیقِ اقبالیات میں یہ سب جامعات سے آگے ہے مگر معیار کا مسئلہ غور طلب ہے۔ اپریل ۲۰۰۳ء کی بین الاقوامی اقبال کانفرنس لاہور کی ایک نشست میں کرسیِ صدارت پر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی تشریف فرما تھے۔ وہ اُن دنوں اوپن یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کے مشیر (consultant) کے عہدے پر فائز تھے۔ کسی موضوع پر مذاکرے کی سی صورت تھی۔ یکے از شرکاے مذاکرہ، ڈاکٹر صدیق جاوید نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے اقبالیاتی مقالوں کا ذکر کرتے ہوئے، اُن کے معیار کو "شرم ناک" قرار دیا۔ راقم نے یونی ورسٹی کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایک سو مقالے لکھے گئے ہیں تو سبھی اعلیٰ درجے کے تو نہیں ہوں گے۔ البتہ ایک سو میں سے دس کے بارے میں مطالبہ بجا ہے کہ وہ اونچے معیار کے ہونے چاہییں۔ ہمیں زمینی حقائق کو بھی پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے۔

اس کے باوجود راقم سمجھتا ہے کہ علامہ اقبال سے منسوب اوپن یونی ورسٹی کو اپنے موجودہ معیارِ تحقیق کو بہتر بنانے پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ (جو اس وقت بہتری و برتری کی طرف مائل نہیں ہے۔) کم از کم معیار ایسا ہو کہ تحقیقی مقالات بلا دریغ شائع کیے جا سکیں۔ غور کرنا چاہیے کہ اب تک جن مقالات پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے، اُن میں سے کتنے قابلِ اشاعت ہیں؟ اور اقبالیات کی پیش رفت میں کتنا کچھ اضافہ (contribute) کرتے ہیں؟

۷

یوسف سلیم چشتی (م: ۱۱ فروری ۱۹۸۴ء) کی معروف حیثیت کلامِ اقبال کے شرح نگار کی ہے۔ غلام رسول مہر (م: ۱۹۷۱ء) کے سلسلۂ مطالب (بانگِ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، اسرار و رموز) کے مقابلے میں، ان کی تشریحات مفصل ہیں۔ اس تفصیل و تطویل میں کہیں کہیں وہ موضوع سے ہٹ جاتے ہیں مگر ان کی علمیت اور راست فکری میں کلام نہیں۔ وہ اقبال کے پورے متداول اردو اور فارسی کلام کے شارح ہیں۔ بلا شبہہ ان کی شرحوں سے اقبال فہمی کا ایک شعور پیدا ہوا۔ اگر کوئی فہیم اقبال شناس ان کی شرحوں کی تدوین کر سکے تو اپنے موضوع پر آج بھی یہ اچھی شرحیں ہیں۔[۵۸] مہر صاحب، صرف چار مجموعوں کے مطالب قلم بند کر سکے۔ یہ شرحیں مختصر ہیں، مگر ان میں ضروری نکات آ گئے ہیں۔[۵۹] کلامِ اقبال کے دیگر جزوی (ایک یا ایک سے زائد مجموعوں یا منتخب کلام کے) شرح نگاروں میں نشتر جالندھری، آقاے رازی، عبدالرشید فاضل، ڈاکٹر محمد باقر، صوفی تبسم، عبدالرحمٰن طارق، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محمد شریف بقا، عارف بٹالوی، عبید اللہ قدسی، اصغر علی شاہ جعفری، غلام احمد پرویز، اقبال احمد خاں، طاہر شادانی، ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر الف د نسیم، اسرار زیدی، فیض لدھیانوی، پروفیسر خالد پرویز اور گوہر ملسیانی شامل ہیں۔ خواجہ حمید یزدانی اور حمید اللہ شاہ ہاشمی نے پورے فارسی کلام کی شرحیں لکھی ہیں۔

اقبال کے بعض اشعار (مثلاً: محمد بھی ترا جبریل بھی...... وغیرہ) کے معانی و مفہوم کے تعین کے لیے قارئین اقبال کے درمیان، دل چسپ بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ بیسیوں کی تعداد میں یہ مباحث اخبارات و رسائل میں منتشر ہیں اور انھیں یک جا کر کے، اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ تشریحات کی ایک نوعیت کلامِ اقبال کی علامات، تلمیحات اور تراکیب کی توضیح و تصریح کی بھی ہے۔ اس سلسلے میں عابد علی عابد (تلمیحاتِ اقبال، ۱۹۵۹ء)، نسیم امروہوی (فرہنگ اقبال، دو حصے، ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۹ء)، مقبول انور داؤدی (مطالبِ اقبال، ۱۹۸۴ء) اور ڈاکٹر اکبر حسین قریشی (مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال، باضافہ ۱۹۸۶ء) کی قابل قدر کاوشیں حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہیں۔

۸

اقبالیاتِ پاکستان کا ایک حصہ منظوم کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں زیادہ تر تو ایسی نظموں کے مجموعے ہیں جن میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ (اس روایت کا آغاز علامہ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا)۔ تاہم ایسے مجموعوں میں وفاتِ اقبال پر لکھے گئے مرثیے، قطعات، کلامِ اقبال پر تضمینات اور اقبال کی زمینوں میں کہی گئی غزلیات وغیرہ شامل ہیں۔ بعض کی نوعیت اقبال کے فکر و فن پر منظوم تنقید و تبصرے کی ہے جیسے: معین الدین جمیل کی مثنوی سر الاسرار (۱۹۶۲ء)۔ نئی منظوم کتابوں میں رفیق خاور کی حرفِ نشاط آور لبِ کوثر (۱۹۷۹ء)، طفیل ہوشیار پوری کی تجدید شکوہ (۱۹۸۷ء)، طاہر لاہوری کی خودی ہے نور فشاں (۱۹۸۹ء) اور اسلم انصاری کی فیضانِ اقبال (۱۹۹۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ نوری صاحب کی ڈاکٹر اقبال سے معذرت کے ساتھ (۱۹۷۸ء)، اس اعتبار سے ایک دلچسپ کتاب ہے کہ مصنف کے بقول یہ ''شعر و شاعری میں صنفِ محکیات میں پہلی کتاب'' ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے مختلف اشعار کا، شعر ہی میں جواب دیا گیا ہے، مثلاً:

اقبال: بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشاے لبِ بام ابھی

نوری: بے خطر کودنے کا ان پر ہے الزام غلط
ان کو پھینکا گیا، وہ کود پڑے کب؟

۹

اقبالیاتِ پاکستان کا ایک حصہ ایسا ہے جسے ''متفرق'' میں شمار کرنا چاہیے کیوں کہ اس میں طرح طرح کی مطبوعات شامل ہیں، مثلاً:

۱- بچوں کے لیے کتابیں
۲- تقاریر اور خطبات
۳- نصابی کتابیں
۴- مصوّر کتابیں
۵- سووی نیر
۶- اقبالیاتی اداروں پر کتابیں
۷- متفرقات

گو ہم نے متفرق کتابوں کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے سات حصوں میں بانٹ دیا، مگر ان سات اقسام میں بھی بھانت بھانت کی کتابیں اور کتابچے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض تو بالکل لغو، بے کار اور فضول ہیں، البتہ بچوں کے لیے تعارفی کتابیں تیار کرنے کی سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں۔ ان میں دو چیزیں بہت اچھی ہیں، محنت سے تیار کی گئی ہیں اور ان کی افادیت میں کلام نہیں۔ اوّل: سید محمد عبدالرشید فاضل کی سلسلۂ درسیاتِ اقبال (۳ حصے، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۷۳ء، ۱۹۹۰ء)، دوم: میرا اقبال مرتبین: زبیر حسین شیخ، سلمان آصف صدیقی (سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ حیدر آباد، ۲۰۰۲ء)، یہ پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے جو بطور اضافی مطالعہ جماعت چہارم سے جماعت ہشتم کے طلبہ و طالبات کے لیے نہایت سلیقے، خوب صورتی اور مہارت سے تیار کیا گیا ہے۔ اسی تسلسل میں مزید تین چار حصے اقبال اکادمی کے زیر اہتمام تیار ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے کی آخری کتاب گریجویٹ کلاس کے لیے ہوگی۔ میرا اقبال کی اب سی ڈی بھی دستیاب ہے۔

نصابی سلسلے میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے، کے لیے شعبۂ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد کی تیار کردہ کتابیں بھی مفید ہیں۔

۱۰

اقبالیاتی ادب کا ایک قابل ذکر حصہ رسائل و جرائد کے خاص اقبال نمبروں پر مشتمل ہے۔ یہ اس روایت کا تسلسل ہے جس کا شاندار آغاز نیرنگِ خیال نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں جب پہلی بار اقبال صدی کی بازگشت سنائی دی تو بعض جرائد نے بڑے وقیع اقبال نمبر شائع کیے۔ تین چار سال بعد، جب حکومتی سطح پر ولادتِ علامہ اقبال کا سو سالہ جشن منایا گیا (۱۹۷۷ء) تو اس تاریخی موقعے کی مناسبت سے اقبال نمبروں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ بعض جریدوں نے ایک سے زائد بار اور بعض نے کئی کئی جلدوں میں خاص نمبر شائع کیے۔ اس ضمن میں مجلّہ اقبال، اقبال ریویو، ادبی دنیا، نقوش، سب رس، سیارہ، افکار معلم اور صحیفہ کی ایک سے زائد بلند پایہ اشاعتیں منظر عام پر آئیں۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری سے ایک گونہ شغف تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب محکمہ تعلیم نے رسائل کے اقبال نمبر شائع کرنے کی ہدایت جاری کی تو یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے علاوہ سکولوں تک نے بڑے جوش و جذبے سے اقبال نمبر مرتب کر کے شائع کیے۔ خیابان پشاور، ضیا بار سرگودھا، راوی لاہور، اورینٹل کالج میگزین لاہور، برگ گل کراچی اور رگِ سنگ لورالائی اور اسی طرح کے بعض دوسرے جرائد کے خاص نمبروں نے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات میں اقبال اور کلامِ اقبال سے دل چسپی اور رغبت میں اضافہ کیا۔ ۲۰۰۲ء کو سالِ اقبال کے

طور پر منایا گیا۔اس موقع پر بھی بہت سے رسائل نے بہت عمدہ اقبال نمبر شائع کیے۔

اقبال نمبروں کا شمار تنقیدِ اقبالیات میں ہونا چاہیے۔علمی و ادبی جرائد کے خاص نمبروں کے ذریعے متعدد بلند پایہ علمی مقالات منظرِ عام پر آئے کیوں کہ ان کے مدیران کرام نے نامور اہلِ قلم اور نقادوں سے بعض اہم موضوعات پر باصرار مقالات لکھوائے،جن میں سے بعض کی حیثیت اقبالیاتی ادب میں قابلِ لحاظ اضافوں کی ہے۔سکولوں اور کالجوں کے خاص نمبر زیادہ تر رسمی اور روایتی نوعیت کی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ طالب علموں سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان فرمایشی نمبروں نے،ایک اقبالیاتی فضا اور ماحول پیدا کرنے میں بہت مدد دی۔

۱۱

آخر میں مختصراً اقبالیاتِ پاکستان کے بعض متفرق پہلوؤں کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔

اول:اقبال اور مطالعۂ اقبال کے اثرات، وسیع الاطراف ہیں۔ایک پہلو یہ ہے کہ متعدد شعرا کے ہاں اقبال کی فکری و معنوی تقلید اوران کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں،مثلاً: **شیخ محمد ایوب**: آبِ حیواں ،نوائے فردا۔ **عرشی امرتسری** : نقش ہاے رنگ رنگ۔ **غلام النصیر چلاسی**: معدن التوحید، گنجینۂ معرفت۔ **عاصی کرنالی**: رگِ جاں۔ **جاوید احمد غامدی**:مقامات وغیرہ۔

دوم: ۶۰ سالوں میں علامہ اقبال پر ہر نوعیت اور ہر معیار وقدر و قیمت کی کتابیں،مضامین اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔ان کی شاعری ہو یا فکر و فلسفہ، مابعد الطبیعیات،خودی و بے خودی،عقل و عشق، حیات و ممات، خیر وشر، جبر و قدر، حسن وفن،فقر و تصوف اور زمان و مکان کا مسئلہ یا ان کی زندگی اور شخصیت......شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہوگا،جس پر خامہ فرسائی نہ کی گئی ہو،مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ:''اقبالیات کے نام سے جو ذخیرۂ ادب تیار ہو چکا ہے، وہ اس پائے کا نہیں، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا''۔[۶۰] کیونکہ بقول تحسین فراقی:

> اقبال کو اب تک جو نقاد ملے ہیں، ان میں کم از کم نوے فی صد ایسے ہیں جن کے یہاں وہ جامعیت مفقود تھی، جو تخلیق کے جوہرِ مخفی کو آئینہ کر دیتی ہے......[اس لیے] بیش تر کام افقی جہات میں ہوا ہے۔اس میں پھیلاؤ تو دریا و صحرا کی خبر لاتا ہے،لیکن عمق نہیں، وسعت ہے، گہرائی نہیں۔[۶۱]

اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال پر قلم اٹھانے کے لیے جس وسعتِ مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کی ضرورت ہے، وہ ہمارے اقبالی نقادوں میں، الا ماشاء اللہ مفقود ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بجا فرماتے ہیں:''اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لیے کئی علوم کی ضرورت ہے۔مشرق و مغرب کے عام علوم کے ساتھ اسلامی علوم بھی سیکھے جائیں تو بات بنتی ہے۔محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا نہیں کر سکتی''۔[۶۲]

سوم: ۱۹۸۷ء کے گیلپ پاکستان سروے کے مطابق، پاکستان کے مقبول ترین شاعر علامہ اقبال ہیں۔[۶۳] بیشتر پاکستانی بچے، اپنے سکول کے پہلے ہی دن سے ''ترانۂ ملی'' کے ذریعے سے اقبال سے متعارف ہوتے ہیں اور پھر مختلف حوالوں سے یہ نام ان کے ملی اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔

چہارم: حکومتِ پاکستان نے ۱۹۷۷ء میں صد سالہ جشنِ ولادتِ علامہ اقبال اور پھر ۲۰۰۲ء کو بطور ''سالِ اقبال'' منانے کا اعلان کیا تو، جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا، بہت سی نئی کتابیں چھپیں، اقبال نمبر شائع ہوئے، سکولوں کالجوں میں اقبال کوئز مقابلے اور تقریری و تحریری انعامی مقابلے منعقد ہوئے۔ مختلف سطحوں پر اقبالیاتی جلسے، اور مذاکرے ہوئے، تین چار بین الاقوامی اقبال کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان اقدامات و وقوعات سے اقبالیات میں خاصی پیش رفت ہوئی، مطالعاتِ اقبال کو فروغ ملا اور اقبالیاتی ادب کے ذخیرے میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

پنجم: اقبالیات، پاکستانی علوم و ادبیات کا ایک بڑا موضوع ہے چنانچہ اقبالیاتی ادب کے مختلف شعبوں میں ٹھوس تحقیق و تنقید کی نہ صرف گنجایش موجود ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ اقبال کے سوانح، شخصیت اور ان کے افکار کے بہت سے پہلو تا حال تشنۂ تحقیق ہیں۔ اقبال کا کلام اور ان کا فکر جتنا وسیع اور ہمہ جہت ہے، اس کے مطالعے کی گنجایشیں اتنی ہی زیادہ ہیں:

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر کی تہ میں ہیں لاکھوں لولوے لالہ

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۴۴ء میں، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے ۱۹۵۵ء میں اور مشفق خواجہ نے ۱۹۶۶ء میں اقبالیات کے جن پہلوؤں اور موضوعات پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی، ان میں سے بیش تر ابھی تک تشنۂ تحقیق چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ معقول کام ہوئے ہیں، وہ بعض اقبال شناسوں کی ذاتی تشویق و کوشش کا نتیجہ ہیں۔

ششم: چند لوگ جو آسمانِ اقبالیات کے روشن ستارے تھے، اب غروب ہو چکے ہیں، مثلاً: یوسف سلیم چشتی، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، افتخار احمد صدیقی، ممتاز حسن، عابد علی عابد، خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر محمد عثمان، محمد رفیق خاور، ڈاکٹر محمد ریاض، رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، چودھری مظفر حسین، پروفیسر محمد منور اور پروفیسر محمد معروف۔ خدا ان سب کی روح کو آسودہ رکھے، اور جو اقبال سکالر حیات ہیں، خدا انھیں اقبالیاتی ادب کے ایوان کو بنانے سنوارنے، سجانے اور مستحکم رکھنے کی بیش از بیش توفیق بخشے، آمین۔

بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انفرادی کاوشیں ایک خاص حد سے آگے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ اقبالیاتی ادب کو باثروت بنانے کے لیے، مطلوبہ تحقیقی وتنقیدی کام: ''بہتر صورت میں...... اسی وقت انجام پا سکتے ہیں جب تمام ادارے ہم آہنگ ہوں اور اقبال سے دل چسپی رکھنے والے تمام اہلِ علم کا تعاون حاصل کریں۔ ان اداروں کو تقسیم کار کے ساتھ اشتراکِ عمل کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔''[۶۴]

ہفتم: جو اقبالیاتی ادارے، خاص فروغِ اقبالیات کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور ان کے پاس وسائل بھی ہیں، اگر وہ محض سرکاری شعبوں اور حکومتی اشاعت گھروں کی حیثیت سے اوپر اٹھ کر، اصحاب فکر و نظر کی مدد سے ٹھوس منصوبہ بندی کریں، اہداف اور ترجیحات مقرر کریں تو یقیناً کہیں زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس سے اقبالیاتی ادب میں مقداری اضافہ تو ہوگا ہی، علمی لحاظ سے بھی اس کا گراف بالیقین بتدریج بلند ہوتا چلا جائے گا۔

یہاں فقط برائے دلچسپی یا عبرت آموزی (یا دونوں اعتبار سے) نامور محقق اور نقاد مشفق خواجہ (۱۹۳۵ء-۲۰۰۵ء) کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہوگا:

> اقبال کے حوالے سے جو ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں ان میں ایسی کتابیں کتنی ہیں جو ہمارے لیے اقبال کی شخصیت اور کمالات سے آگاہی کا وسیلہ بنتی ہیں؟ بمشکل ۲۵، ۳۰ کتابیں ایسی ہوں گی جو اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں ہماری معاون ہو سکیں، باقی سارا ذخیرہ ضائع بھی ہو جائے تو اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا! سوائے ان اداروں اور افراد کے جو اقبال کا نام کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔[۶۵]

۶۰ برسوں میں اقبالیات کا ارتقا ایک ایسا بحرِ زخار ہے جس کی گہرائی اور گیرائی نامعلوم ہے۔ بقول خورشید رضوی:

تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

سطورِ بالا کا مطالعہ اس امر کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جائے تو مناسب ہوگا کہ موضوعِ زیرِ بحث اصل میں پوری ایک کتاب کا موضوع ہے — ایک ایسا وسیع و عریض موضوع، جس کی مختلف جہتوں، پرتوں اور ابعاد کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں چنانچہ اسے بعجلت ایک مختصر مضمون میں سمیٹنے اور کوزہ بند کرنے کی کوشش ناقص و ناتمام ہی رہے گی۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔ وَ مَا توفیقی اِلّا بِاللّٰہ۔

حوالے وحواشی

۱- مخزن، لاہور، اپریل ۱۹۰۱ء، ص ۳۳۔

۲- سید وقار عظیم (مرتب): اقبال' معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۳- اس کی ایک نمایاں مثال ادب اور انقلاب (اختر حسین رائے پوری)۔ ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۳ء، میں شامل مضمون ہے: ''ادب اور زندگی'' (اپریل ۱۹۳۵ء)۔

۴- زمانہ، کان پور، فروری ۱۹۲۹ء، ص ۱۱۸۔

۵- بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، ۷/جنوری ۱۹۳۱ء، بحوالہ: حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے (مرتب: محمد حمزہ فاروقی) ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳۳-۴۳۴۔

۶- خاص طور پر مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے دسمبر ۱۹۷۳ء میں ''اقبال صدی'' کی مناسبت سے چند کتابیں شائع کیں اور مجلس کے زیر اہتمام ۲-کلب روڈ کے لان میں ایک تقریب منعقد کی۔ اس موقع پر ایک نمایش کتب و مقالات بھی منعقد ہوئی تھی۔

۷- مذکورہ کلیات پر تبصرے کے لیے دیکھیے: راقم کی کتاب تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء، باب ۱، ۲۔

۸- تحقیق، تدوین، روایت: رشید حسن خاں۔ دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۸۹۔

۹- ایجوکیشنل ٹریڈرز، لاہور۔

۱۰- تفصیل دیکھیے: اقبالیاتی ادب کے تین سال: رفیع الدین ہاشمی۔ حرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۳۴، ۳۵۔

۱۱- تحقیق، تدوین، روایت: ص ۹۱۔ کلامِ اقبال کی تحقیقی تدوین پر جناب رشید حسن خاں کا مضمون: ''کلامِ اقبال کی تدوین'' مطبوعہ: سیارہ لاہور، ستمبر ۱۹۹۶ء، اب مشمولہ: تحقیق، تدوین، روایت، یہ مضمون اور اس کے ساتھ راقم کا مضمون مشمولہ: اقبالیات: تفہیم و تجزیہ، اقبال اکادمی لاہور، [۲۰۰۵ء] دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

۱۲- اس پر راقم کا ایک تفصیلی تبصرہ، دیکھیے: ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳ تا ۳۱۔

۱۳- ناشر: یونی ورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، طبع دوم: اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۱۴- مشمولہ، جہات اقبال: ڈاکٹر تحسین فراقی۔ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲ تا ۲۹۔

۱۵- ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۱۶- دیکھیے: تصانیف اقبال، ص ۴۴۸، نیز: خطبۂ علی گڑھ کی دریافت کے ضمن میں راقم کی ایک توضیح دیکھیے: اقبالیاتی ادب کے تین سال، ص ۳۳-۳۴۔

۱۷- یہ مقالہ: چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال: روابط کے عنوان سے ۱۹۸۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں ۲۶ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔ بعد ازاں یہ خطوط شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّے تحقیق نامہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔ اب ان میں سے ۲۰ خطوط، مکتوبات اقبال (بنام چودھری محمد حسین) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں (ناشر: الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔)

۱۸- مظلوم اقبال کے بعض خطوط، مکمل صورت میں شاعر بمبئی کے اقبال نمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہو گئے ہیں۔ ۹ جون اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خطوط بہت اہم ہیں، دیکھیے: ص ۵۵۱ تا ۵۵۵۔

۱۹- کلیات مکاتیب اقبال، ۴ جلدیں (دہلی، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۸ء)۔

۲۰- کلیاتِ مکاتیب اقبال کی جلد سوم پر تحسین فراقی صاحب کا نقد، ان کی کتاب اقبال: چند نئے مباحث (لاہور، ۱۹۹۷ء) میں شامل ہے۔ اقبال کی اردو نثر (زیب النساء۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۱ء) میں بھی کلیاتِ مکاتیب کی ۴۷/اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۲۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: ماسٹر اختر کی حسب ذیل کتابیں:

۱۔ ریاست بھوپال اور اقبال۔ بھوپال، ۱۹۸۷ء۔

۲۔ اقبال کے کرم فرما۔ دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۳۔ اقبالیت اور اقبالیات۔ بھوپال، ۲۰۰۶ء۔

اول الذکر دو کتابوں پر راقم کا اظہارِ خیال دیکھیے: اقبالیاتی ادب کے تین سال، ص ۱۲۲-۱۲۵۔

۲۲- انوار اقبال مرتبہ: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۵۶، ۱۹۴۔

۲۳- اس کتاب کا پورا نام اس طرح ہے:

Ms Translation by Professor Arthur J.Arberry of

گلشنِ راز جدید

The New Garden of Mystery by Allama Muhammad Iqbal

مع اصل فارسی متن مشمولہ: زبور عجم ــــ توضیحات اور متبادل ترجمہ از ڈاکٹر سعید اختر درانی، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی کراچی، ۲۰۰۵ء۔

۲۴- منظوم اردو ترجمہ کلیاتِ اقبال، فارسی، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۲۵- خطبات کا ایک اردو ترجمہ بھارت سے بھی شائع ہوا بعنوان: تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر از محمد سمیع الحق، دہلی ۱۹۹۴ء۔

۲۶- یہ مضمون، قدرے ترمیم کے بعد، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مجموعۂ مضامین: مسائل اقبال (مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۴ء) میں شامل ہے۔

۲۷- ان کا مرتبہ اشاریہ اقبالیاتِ معارف اعظم گڑھ، مجلّہ اقبالیات لاہور (جنوری ۲۰۰۷ء) میں شائع ہوا ہے۔ بعض دیگر علمی رسائل (صحیفہ، لاہور، اقبالیات، سری نگر، نقوش، لاہور، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اقبال

ریویو' حیدرآباد وغیرہ) کے اشاریے زیرِ ترتیب واشاعت ہیں۔

۲۸- روزنامہ جنگ کراچی، ۲۲/اپریل ۱۹۶۶ء۔ یہ مضمون مصباح الحق صدیقی کی مرتبہ کتاب: علامہ اقبال، اپنوں کی نظر میں (فرحان پبلشرز لاہور، ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔

۲۹- اس سلسلے کے بیشتر مضامین راقم کی تالیف: اقبالیاتی جائزے (لاہور، ۱۹۹۰ء) میں شامل ہیں۔ مضمون نمبر ۲، اور ۳ نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد اقبالیاتی جائزے کے زیرِ طبع دوسرے اڈیشن بعنوان: اقبالیاتی ادب میں شامل ہیں۔

۳۰- مشمولہ: جہات اقبال۔

۳۱- اقبالیاتی جائزے، ص۲۲، نیز: ص ۱۰۵ تا ۱۰۹۔ نیز: دیکھیے راقم کا مجموعۂ مقالات: تفہیم و تجزیہ (کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۹۹ء) ص ۹۸ حاشیہ ۱۲۔

۳۲- سر گذشت اقبال: ایک محاکمہ، خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۳۳- متذکرہ سوانح عمریوں کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: راقم کا مضمون ''علامہ اقبال کی سوانح عمریاں'' مشمولہ: اقبالیاتی جائزے۔ نیز: ''اقبال صدی کی سوانح عمریاں'' مشمولہ: اقبالیات: تفہیم و تجزیہ۔

۳۴- اقبالیات: مہر سنز، ۱۹۸۸ء، ص ۴۹۔ نیز دیکھیے: چند یادیں، چند تاثرات، حصہ دوم از عاشق حسین بٹالوی، پیکیجز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۳، ۱۳۵۔

۳۵- ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین ان کے مجموعے: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ (لاہور، ۱۹۶۵ء) میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد باقر اور صفدر محمود کے مضامین صحیفہ، لاہور، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔ ملک حسن اختر کا مضمون، ان کے مجموعے: اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ (لاہور، ۱۹۸۸ء) میں شامل ہے۔

۳۶- مشمولہ: حیات اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۳۷- مشمولہ: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۳۸- سیارہ، لاہور، مارچ ۱۹۷۹ء نیز: اقبال کا شعلہ نوا، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷۷ تا ۳۰۱۔ جناب نعیم صدیقی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقبال کے خلاف شبہات کا غبار پھیلا دیا جائے تو پھر جتنی روشنی ان سے حاصل کی جاسکتی ہے، وہ بھی نہیں مل سکے گی۔ (ص ۲۸۲)

۳۹- اقبال کا شعلہ نوا، ص ۲۹۳۔

۴۰- حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور، ص ۳۰۸۔

۴۱- عطیہ بیگم کی یہ کتاب ایک تفصیلی تحقیقی مطالعے کی متقاضی ہے۔ عطیہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ماہر القادری کا ایک مضمون بہت اہمیت رکھتا ہے، جس کے بعض حصے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب ذکر و فن (جموں، ۲۰۰۳ء) میں نقل کیے ہیں۔

۴۲- ایضاً، ص ۱۳۸۔

۴۳- جابر علی سید کے دو مجموعے اقبال کا فنی ارتقا (۱۹۷۸ء)، اقبال: ایک مطالعہ (۱۹۸۵ء) اور افتخار احمد

صدیقی کی کتاب عروج اقبال (۱۹۸۷ء) بزم اقبال لاہور نے شائع کی۔ نذیر احمد کی اقبال کے صنائع بدائع (۱۹۶۲ء) اور تشبیہات اقبال (۱۹۷۷ء) اور سعد اللہ کلیم کی اقبال کے مشبہ بہٖ و مستعار منہ (۱۹۸۵ء) علی الترتیب آئینۂ ادب لاہور اور اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے چھپیں۔ تبسم کاشمیری کی شعریات اقبال (۱۹۷۸ء) مکتبہ عالیہ لاہور نے شائع کی۔

۴۴- سید صاحب کے باقیاتِ اقبالیات کا ایک مجموعہ راقم الحروف نے مرتب کیا ہے، جو کتابت کے مرحلے میں ہے۔

۴۵- مقالاتِ ممتاز (مرتب: شان الحق حقی، ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۹۵ء) میں اقبالیات پر ممتاز حسن کی ۲۰ تحریریں شامل ہیں۔ اسی مجموعے میں شامل، ایک مضمون میں راقم نے ممتاز حسن کی اقبال شناسی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مقالات کا ایک اور مجموعہ علامہ اقبال: ممتاز حسن کی نظر میں کے نام سے ڈاکٹر محمد معز الدین نے مرتب کیا (اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۱ء) اس میں پندرہ تحریریں شامل ہیں۔

۴۶- ان پر راقم کا ایک مضمون: ''ڈاکٹر محمد ریاض: ایک ہمہ جہت اقبال شناس'' مطبوعہ: قومی زبان کراچی، مئی ۱۹۹۷ء، ص ۶۰ تا ۶۳۔

۴۷- ان کی اقبالیاتی خدمات کے لیے دیکھیے، زبیدہ جبیں کی کتاب: پروفیسر محمد منور بطور اقبال شناس، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۴۸- نہ صرف ڈاکٹر رحیم بخش شاہین بلکہ پاکستان کے دیگر حسب ذیل اقبال شناسوں پر ایم اے اور ایم فل یا پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں: سید نذیر نیازی، یوسف سلیم چشتی، چودھری محمد حسین، غلام رسول مہر، بشیر احمد ڈار، ممتاز حسن، محمد عبداللہ قریشی، پروفیسر محمد عثمان، عابد علی عابد، سید عبداللہ، افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جاوید اقبال، عبدالرحمٰن طارق، سید محمد عبدالرشید فاضل، سلیم احمد، غلام احمد پرویز، راجا حسن اختر، علی عباس جلال پوری، جابر علی سید، ملک حسن اختر، میاں محمد شفیع [م۔ش]، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد طاہر فاروقی، سید وقار عظیم، سید عبدالواحد معینی، ڈاکٹر محمد ریاض، فقیر سید وحید الدین، ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور رفیع الدین ہاشمی۔

۴۹- حال ہی میں مولوی عبدالرزاق راشد کا مرتبہ: کلیاتِ اقبال (حیدرآباد دکن، ۱۹۲۴ء) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تعارف اور تقدیم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کاش یہ تاریخی کلیات بھی، مشفق خواجہ کی مرتبہ: اقبال از احمد دین کے طرز پر مدوّن کی جاتی۔

۵۰- دیکھیے: فنون، لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء، فروری، جون، ستمبر، دسمبر ۱۹۷۴ء۔

۵۱- دیکھیے: نوائے وقت، لاہور، ۱۸/اگست ۱۹۷۸ء، ۲۰/اکتوبر ۱۹۷۸ء وغیرہ۔

۵۲- تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھیے: اقبالیاتی ادب کے تین سال، ص ۸۳ تا ۸۸۔

۵۳- ایضاً، ص ۸۸ تا ۹۴۔

۵۴- خطبات پر مباحث کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص ۹۴-۹۹۔ نیز مظفر حسین صاحب کے کتابچے اقبال شناسی کے نئے زاویے (لاہور، ۱۹۹۸ء) اور اقبال شناسی کا انحطاط، آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۹ء، نیز اقبالیات: تفہیم و تجزیہ، ص ۴۳-۶۲۔

۵۵- اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ساحل، کراچی کے ۲۰۰۶ کے شمارے۔ تعمیر افکار، کراچی، جنوری ۲۰۰۷ء۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور کا کتابچہ: میارا بزم بر ساحل کہ آنجا، نیز: اس زمانے کے احیاے علوم (شاہکار میگزین)، لاہور، کے متعدد شمارے۔

۵۶- علامہ اقبال اور غایت پاکستان از مظفر حسین، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۸، ۵۹۔

۵۷- پاکستان کی منزل مراد اور ہمارے دینی راہ نما از مظفر حسین، آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴...... جناب مظفر حسین نے حسب ذیل کتابیں بھی شائع کی ہیں: پاکستان، نفاذ اسلام اور اقبال (۱۹۹۳ء)، احیائے اسلام کے دو اسلوب (۱۹۹۵ء)، پاکستان کی دینی سیاست (۱۹۹۶ء)، مغربی جمہوریت اور علامہ اقبال (۱۹۹۸ء)۔

۵۸- تفصیل دیکھیے: اختر النسا کا تحقیقی مقالہ ایم اے اردو، بعنوان: یوسف سلیم چشتی بحیثیت شارح اردو، شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۵ء۔ مقامِ مسرت ہے کہ چشتی مرحوم کے ایک شاگرد اور مداح جناب محمد زین العابدین صاحب نے چشتی صاحب پر تحقیقی کام اور ان کی شرحوں کو تدوین نو کے بعد شائع کرنے کا ایک پُرعزم منصوبہ تیار کیا ہے۔

۵۹- مطالب بانگ درا وغیرہ، ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

۶۰- قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی: اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۹۔

۶۱- جہاتِ اقبال، ص ۱۶۲۔

۶۲- مسائل اقبال، ص ۹۔

۶۳- روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۶۴- مشفق خواجہ: روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۲/ اپریل ۱۹۶۶ء۔

۶۵- علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال، بیگم رشیدہ آفتاب اقبال، کراچی، ۱۹۹۹ء۔